جدید غزل
از
پروفیسر رشید احمد صدیقی
صدر شعبۂ اُردو، مسلم یونی ورسٹی، علیگڑھ
اُردو اکیڈمی سندھ کراچی

جدید غـــزل

خطبۂ افتتاحیہ

پروفیسر رشید احمد صدیقی

صدر شعبۂ اردو ، مسلم یونیورسٹی ، علی گڑھ

اُردو اکیڈمی سندھ، کراچی

حــــرف آغاز

یورپی یونیورسٹیوں کی یہ قدیم رسم ہے کہ پروفیسری کا اعلیٰ اعزاز حاصل کرنے کے بعد اہل علم اپنے مضمون سے متعلق ایک افتتاحیہ مقالہ صلائے عام کے طور پر پڑھتے ہیں - یہ روایت اب مسلم یونیورسٹی میں بھی شروع ہوئی ہے -

پروفیسر رشید احمد صدیقی ، صدر شعبہ آردو ، مسلم یونی ورسٹی کا یہ مقالہ اس سلسلے کی ایک کڑی ہے ، جسے موصوف نے پروفیسری کے منصب پر فائز ہونے کے بعد علی گڑھ کے ایک ادبی اجتماع میں ۲۶ اگست ۱۹۵۴ء کو پڑھا تھا -

امید ہے کہ ادبی حلقوں میں اس خطبے کا مناسب خیر مقدم کیا جائے گا -

سید بشیر الدین

مہتمم توسیعی خطبات مسلم یونی ورسٹی

جدید غزل

غزل جتنی بدنام ہے اتنی ہی مجھے عزیز ہے - شاعری کا ذکر آتے ہی میرا ذہن غزل کی طرف مائل ہوجاتا ہے - غزل کو میں اردو شاعری کی آبرو سمجھتا ہوں - ہماری تہذیب غزل میں اور غزل ہماری تہذیب میں ڈھلی ہے - دونوں کو سمت و رفتار رنگ و آہنگ ، وزن و وقار ایک دوسرے سے ملا ہے -

ہندوستان میں جن زبانوں ، بولیوں یا روایات کی بڑی مان دان ہے یا رہی ہے اردو ان کی غزل ہے اور اردو کی بیت الغزل ، غزل ا فن ہی نہیں فسوں بھی ہے ، شاعری نہیں تہذیب بھی ، وہ تہذیب جو دوسری تہذیبوں کی نفی نہیں کرتی بلکہ ان کی تصدیق کرتی ہے - کبھی تنقید و تزکیہ بھی - ہندوستان نے اردو کے آئینے میں پہلی بار جمہوریت کی تصویر دیکھی -

غزل کے اصطلاحی ، ابتدائی اور روایتی مفہوم پر زور دینے کی ضرورت نہیں رہی - فن ہو ، روایت ہو ، مذہب و اخلاق ہو، ان کا رشتہ اپنے ماسبق سے ضرور ہوتا ہے - لیکن ان کی قدر و قیمت کا اندازہ کسی اور بنا پر کیا جاتا ہے - غزل کی اہمیت کا انحصار اب اس پر نہیں ہے کہ کبھی اس میں عشق و شباب کی باتیں کی جاتی تھیں یا اس کے وسیلے سے عورتوں سے گفتگو کی گئی یا کی جاتی ہے - اس کا احترام اس لئے کیا جاتا ہے کہ اس سے گفتگو کرنی آجاتی ہے -

اردو میں ہر طرح کی شاعری ہوئی ہے - ہر طرح کے شاعر گزرے ہیں ، شاعری کا مقصد و محور بھی جداگانہ رہا ہے - لیکن ہماری شاعری میں اثر اور قبول عام کا جادو غزل سے نہیں تو غزل ہی کے آداب و آہنگ سے جگایا گیا ہے -

غزل میں ہمارے یہاں بے راہ روی ملتی ہے ، ہر طرح کی بے راہ روی اور جی بھر کے بے راہ روی - یہ غزل کا قصور نہیں ہے - یہ اس راہرو کا قصور ہے جو اپنی کم نگہی یا کم ظرفی سے رہ گذر کے فریب کو منزل مقصود سمجھ لیتا ہے - ادنیٰ درجے کے لوگوں نے زندگی کی بڑی

قدروں کی اسی طرح بے حرمتی کی ہے - غزل کو برا بتانا یا اسے ادنیٰ درجے کی شاعری قرار دینا پڑھے لکھے سمجھ دار لوگوں کے نزدیک اب ہنسی کی بات سمجھی جاتی ہے !

صنف شاعری کے اعتبار سے میں غزل کو سب سے اونچا درجہ نہیں دیتا ، نہ اچھے سے اچھے غزل گو کو سب سے بڑا شاعر ماننا ضروری سمجھتا ہوں - غزل ساری شاعری بھی نہیں ! شاعر کا درجہ اصناف سخن سے متعین بھی نہیں ہوتا - شاعری دنیا کی مادری زبان ہے - اس لئے شاعری میں مخصوص ذہن زندگی اور زمانہ کی ترجمانی اور تلاش ضروری بات ہو تو ہو آخری بات نہیں ہے ! البتہ ایسی شاعری میں اعلیٰ انسانی اور فنی قدروں کا پایا جانا ضروری ہے اور میرے نزدیک اعلیٰ انسانی قدریں وہ ہیں جو زندگی اور کائنات کے بامراد اور برگزیدہ ہونے پر دلالت کرتی ہوں -

ادنیٰ ، اچھی یا اعلیٰ شاعری کا دار و مدار اس پر ہے کہ شاعر کس سطح سے شاعری کا حق ادا کر رہا ہے - زندگی کی آنی و فانی لذت و الم سے رشتہ جوڑتا ہے یا زندگی اور فن کی اعلیٰ قدروں کو جانتا اور کائنات کی عظمت کو پہچانتا ہے - شاعری فنون لطیفہ میں ہے لیکن

میں صرف ان فنون لطیفہ پر ایمان رکھتا ہوں جو فنون عظیمہ کا درجہ رکھتے ہوں۔

غزل پر غالباً سب سے بڑا اعتراض جواب تک کسی نے نہیں کیا یہ ہے کہ وہ غزل کیوں ہے؟ کچھ اور کیوں نہیں! اس کا جواب جسے یقیناً کوئی نہ مانے گا یہ ہے کہ وہ تو غزل ہے کچھ اور کیوں ہو!

بظاہر یہ دونوں باتیں عجیب سی معلوم ہوں گی۔ یہ اس لئے کہ غزل اس سے بھی زیادہ عجیب ہے۔ غزل کو فوج کشی کے لئے آلات حرب و ضرب اور دوسرے ساز وسامان بہت کم دیے گئے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ ان آلات و ساز و سامان کے استعمال پر طرح طرح کی پابندیاں بھی عائد کر دی گئی ہیں لیکن مہم یہ سپرد کی گئی ہے کہ وہ تسخیر سب کچھ کرے! غزل کی مہم میں جبری فوجی بھرتی ممنوع ہے، پروپیگنڈا بھی نہیں کرسکتے۔ با الفاظ دیگر غزل کے صحیفہ میں دو غزلہ، سہ غزلہ، قافیہ پیمائی، شعبدے پینترے، اوباشی، نعرہ زنی، تو بہ استغفار سب ممنوع ہے۔

"ستارہ می شکنند و آفتاب می سازند" کا عمل شراب سے کہیں زیادہ غزل کے ہر شعر پر کرنا پڑتا ہے۔ غزل

صنف سخن ہی نہیں معیار سخن بھی ہے۔

جو بات ابھی کہی گئی ہے اس کا برعکس بھی صحیح ہے۔ غزل میں آپ کو ہر طرح کی آزادی بھی حاصل ہے۔ یعنی آپ جو بحر ردیف ، قافیہ ، مواد ، موضوع لب و لہجہ چاہیں اختیار کرلیں جیسا کہ بیشتر شعراء کرتے آئے ہیں۔ البتہ وہ اس نکتہ سے بے خبر رہے کہ جہاں بے کراں آزادی دی جاتی ہے ، وہاں بے کراں پابندی خود بخود عائد ہو جاتی ہے۔ جس کو نظر انداز کر دینے سے شاعر اور اس کا کلام دونوں اعتبار سے گر جاتے ہیں۔ یہ بات شاعری ہی پر صادق نہیں آتی ، فرد ، جماعت ، قوم ملک اور لیڈر سب پر آتی ہے۔

اب ان پابندیوں پر بھی غور کر لیجئے۔ جو غزل گو کے جذبہ ، ذہن ، ذوق اور تخئیل کو

"نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں"

ہونے سے روکتی ہیں۔

شاعر کو اپنی ذہنی کیفیت کے مطابق بحر اختیار کرنی پڑتی ہے۔ ردیف اور قافیہ کی ظاہری اور معنوی درو بست کا لحاظ کرنا پڑتا ہے۔ زبان اور لہجہ کیا ہوگا۔ کس طرف کس حد سے بڑھ سکتے ہیں۔ بات کتنی ظاہر

کی جائے گی کتنی چھپائی جائے گی ۔ کہاں پردہ سے بے پردگی اور کہاں بے پردگی سے پردہ مقصود ہوگا ۔ پھر فن اور زبان کی تمام ممکنہ خوبیوں کا اظہار، غرض بسیار شیوہ ہاست بتاں را کہ نام نیست ! ان تمام پابندیوں سے صرف وہی شاعر عہدہ برآ ہوسکتا ہے :۔

نگاہ جس کی ہو بے داغ ، ضرب ہوکاری !

یہ باتیں شاعرانہ یا فقیہانہ نہیں ہیں ۔ ہمارے سر برآوردہ غزل گویوں نے اس ہفت خوان کو طے کیا ہے ! غزل "ریزہ کاری"، میں مینا کاری ہے !

حسرت نے جو اردو شاعری کے بڑے رسیا اور پارکھ تھے ہماری شاعری کو مختلف انواع میں تقسیم کیا ہے ۔ مثلاً عاشقانہ ، عارفانہ ، نافعانہ ، ماہرانہ ، باغیانہ ، فاسقانہ وغیرہ ۔ یہ ہماری شاعری کی رنگا رنگی اور جامعیت کی دلیل ہے ۔ یہ رنگا رنگی افراد اور اس کے بعد جماعت اور ذہن اور ذوق پر نادانستہ لیکن قطعی طور پر اپنا اثر ڈالتی ہے ۔ یہ اثر کبھی میکانکی ہوتا ہے کبھی جذباتی وجمالیاتی کبھی فکری اور رومانی اور آپ یقین فرمائیں اس وقت چار پانچ ہزار شعراء خواہ وہ فقر وفاقہ میں مبتلا ہوں ، خواہ فتنہ و فساد میں، شعر کہہ رہے ہوں گے ۔ یہ اشعار اچھے ہوں یا نہیں اشاعت پائیں یا نہیں یہ عادت معقول ہو یا

نہیں ، ان سے کسی سے بحث نہیں لیکن یہ صورت حال سیکڑوں سال سے چلی آرہی ہے - اس کا اثر ہماری زبان کی ساخت و پرداخت اور ذہن و تخئیل کے سمت و رفتار پر کیا پڑا ہوگا اس کا اندازہ آسانی سے لگایا جاسکتا ہے -

یہ بات آردو کے علاوہ دوسری زبان و ادب کے لکھنے بولنے والوں کے بارے میں بھی کہی جاسکتی ہے لیکن اس فرق کو نظر انداز نہ کرنا چاہیے کہ بعض زبانوں اور اس کو کام میں لانے والوں میں اس کی صلاحیت ہوتی ہے اور اس کا حوصلہ بھی کہ وہ ہر رنگ کو اپنے رنگ میں یا اپنے رنگ کو ہر رنگ میں اجاگر کرسکتے ہیں اور بعض میں یہ صلاحیت نہیں ہوتی - آردو اور آردو بولنے ، لکھنے والوں میں اس کی بڑی صلاحیت ہے - اس صلاحیت کا دار و مدار اس پر ہے کہ کون زبان بقائے نسل پر اکتفا کر لیتی ہے اور کون ارتفاع نسل کے درپے رہتی ہے - اس نظریہ کے ماتحت آردو زبان اور آردو شعر و ادب کی اہمیت اور صلاحیت پر غور کیجئے -

اسی بنا پر میرا یہ خیال ہے کہ غزل ، غزل ہونے کے علاوہ ایک نقطۂ نظر ، ایک اندازِ فکر ، ایک اصول تلخیص اور ایک سلیقۂ اظہار بھی ہے - چنانچہ اردو

شعر و ادب میں جتنی اصناف اور اصناف میں جتنے اندازملتے ہیں ملک کی غالباً کسی دوسری زبان میں نہیں ملتے ۔

ایک معمولی سی مثال طنز وظرافت کی ہے ۔ طنز و ظرافت پر میں یہاں بحث نہ کروں گا لیکن اپنا یہ عقیدہ ظاہر کر دینا چاہتا ہوں کہ میں طنز وظرافت کو شعر و ادب کا بڑا اہم صحت مند اور ترقی پسند رجحان سمجھتا ہوں ۔ طنز وظرافت سے زندگی میں جو شعر و ادب کا حقیقی اور لازوال سرچشمہ ہے ، تازگی و توانائی آتی ہے ۔ اس کے علاوہ مرثیہ کی صنف کیوں نہیں ملتی ۔ بالخصوص اس درجے کا مرثیہ جو انیس و دبیر کا دیا ہوا ہے ۔ یہ بات قصائد ، مثنوی اور مسدس اور رباعی کے بارے میں بھی کہی جاسکتی ہے ۔ اردو میں جس درجے کے افسانے (از قسم طلسم ہوشربا، داستان امیر حمزہ ، چہار درویش ، حاتم طائی) ملتے ہیں وہ ملک کی دوسری زبانوں میں کیوں نہیں ہیں ! تاریخ ، تنقید ، تذکرہ، سیر ، کلام وغیرہ پر بھی یہی بات صادق آتی ہے۔ بات غزل سے دورجا پڑی لیکن کیا کروں ۔

صبا حکایت زلف تو درمیاں انداخت !

کہنا یہ چاہتا تھا کہ ان تمام اصناف نظم و نثر کو حیات،

حرکت اور حسن غزل نے دیا ہے ۔ آردو شعر و ادب میں غزل کا درجہ آم الاسالیب کا ہے !

آردو غزل کا سلسلہ نسب فارسی سے ہوتا ہوا عربی تک پہنچتا ہے لیکن عرب کی ہر تحریک خواہ وہ مذہب و اخلاق سے تعلق رکھتی ہو یا شعر و ادب اور تہذیب وتمدن سے ایران کے مکتب و میخانہ سے اکتساب رنگ و بو کرتی ہندوستان پہنچی ہے ۔ اس لئے اردو غزل میں عربی ، ایرانی دونوں رنگ ملتے ہیں ۔ آردو غزل ہی کو نہیں دوسرے اصناف کو بھی فارسی کے ڈھلے ڈھلائے اور منجے منجائے اسالیب ملے ۔ غزل کے علاوہ قصائد ، مثنوی مسدس ، رباعی سب فارسی ہی سے آردو میں آئے ۔

نظم و نثر کی دوسری اصناف سے قطع نظر اگر آردو غزل کا موازنہ فارسی غزل سے کیا جائے تو آردو غزل کا پایہ یقیناً بھاری ہوگا ۔ فکر ، فسوں ، فن ہر اعتبار سے اور یہ دین ہے غالب اور اقبال کی ۔ اس کا سبب یہ ہے کہ آردو غزل کو ہندوستان میں جن تاریخی ، تہذیبی اور ادبی حالات و روایات ، تحریکات ، تہلکات و تجربات اور جن اقوام ، ادب ، شخصیتوں ، حریفوں اور حلیفوں کا دور اور نزدیک سے سابقہ رہا وہ ایران میں فارسی کو میسر نہ آیا !

فارسی غزل گوئی کی اہمیت و وقعت سے انکار نہیں تقریباً تمام اصناف سخن جن میں غزل بھی شامل ہے آردو کو فارسی ہی نے دی ہیں ۔ یہی نہیں بلکہ آردو غزل کی خوبی و خوبصورتی اور تب و تاب میں فارسی کا بڑا دخل ہے لیکن جیسا کہ عرض کیا گیا آردو غزل کو ہندوستان میں جن حالات و حوادث کا سامنا رہا فارسی کو ایران میں نہ تھا ۔ اس کا اثر ایران اور ہندوستان کی غزلوں پر نمایاں ہے ۔ حافظ اور سعدی کو فارسی غزل میں جو بلند مقام حاصل ہے اس سے کون نہیں واقف ہے لیکن اگر اس کے ساتھ ساتھ ہم خسرو ، عرفی ، نظیری ، ظہوری ، غالب اور شبلی کی غزلوں کا مطالعہ کریں جو تمامتر ہندوستان میں تصنیف ہوئیں تو اندازہ ہوگا کہ ایران کی غزل گوئی اور ہندوستان کی غزل گوئی میں رنگ و آہنگ کا کتنا فرق ہے ۔ جب یہ حال فارسی غزل کا ہے تو آردو غزل کا کیا عالم ہوگا جو تمامتر ہندوستان کی ساختہ پرداختہ ہے اور جس میں فارسی نے مزیدخوبیوں کا اضافہ کیا ہے !

آردو اور فارسی کا تقابلی مطالعہ کرنے والوں کی نظر سے یہ حقیقت پوشیدہ نہ ہوگی کہ باوجود اس کے کہ آردو غزل فارسی غزل کے طرز پر ڈھلی ہے معنوی اعتبار سے آردو غزل بجائے خود فارسی غزل گوئی سے اتنا متاثر

نہیں ہے جتنا کہ عام طور پر خیال کیا جاتا ہے - غالب
کے سوا جو بعض شعرائے فارسی کے خاص طور پر معترف
ہیں آردو کا کوئی مشہور و مستند شاعر فارسی کے کسی
شاعر کا پیرو نہیں ہے - یہی حال اقبال کا ہے - قطع نظر
اس سے کہ اقبال کس فارسی شاعر کے کیوں معتقد ہیں
اقبال کی آردو غزلیں کسی آردو یا فارسی شاعر کے رنگ
میں نہیں ہیں -

آردو پر تمام تر کلاسیکی فارسی کا احسان ہے -
جدید فارسی کا آردو پر کوئی اثر نہیں - اکثر کچھ ایسا
بھی محسوس ہوا ہے جیسے گذشتہ سو سال میں جو آردو غزل
کا سب سے شاندار زمانہ ہے ایران کے غزل گویوں کے
پاس آردو غزل کو دینے کے لیے کچھ نہ رہ گیا ہو - میں
سمجھتا ہوں کہ اگر جدید ایرانی شعرا آردو کے جدید سر بر
آوردہ غزل گویوں کا کلام مطالعہ کریں تو وہ اپنے عہد کی
غزل گوئی کو بہت کچھ نفع پہنچا سکتے ہیں - آردو غزل
نے پہلے کبھی فارسی غزل سے جو قرض لیا تھا اب وہ اس
کو کئی گنا بڑھا کر ادا کر سکتی ہے اور آردو غزل کی اس
پیشکش سے جدید فارسی خاطر خواہ فائدہ اٹھا سکتی ہے !

آردو غزل کی مقبولیت میں جہاں اور باتیں معین

ہوئی ہیں ، وہاں غزل کی صحیح ، سلیس ، شیریں ، شستہ
اور شائستہ زبان بھی ہے - زبان کے مانجنے ، سنوارنے
اور مجل کرنے میں آردو والوں نے جیسا ریاض کیا ہے ،
رسوائی آٹھائی ہے اور کسی طرح کی رو رعایت پر کسی
حال میں تیار نہیں ہوئے اس کی مثال شاید ہی کسی
اور زبان میں ملتی ہو - زبان کا یہ التزام جہاں اپنے اندر
بہت سی خرابیاں رکھتا ہے وہاں بہت سی خوبیوں کا بھی
باعث رہا ہے - یہاں ان خوبیوں یا خرابیوں کا جائزہ لینا
مقصود نہیں ہے - بتانا یہ ہے کہ آردو میں یہ التزام اس
لیے آیا کہ اس کا سابقہ بہت سی ایسی مقامی اور غیر
مقامی ، ذی حیثیت اور مختلف النوع زبانوں اور بولیوں
سے رہا جو عوام اور خواص دونوں میں یکساں مقبول
تھیں - آردو نے ان سب کے رنگ روپ کو اپنے رنگ میں
ڈھالا اور نکھارا -

آردو کا معمولی طالب علم بھی جانتا ہے کہ آردو
میں کتنی اور کیسی کیسی زبانوں کی خوبو کس خوبی سے
سموئی ہوئی ملتی ہے - فارسی کو ان مراحل سے گزرنے کا
بہت کم اتفاق ہوا وہ بھی مدتوں کے وقفہ کے بعد !
شاعری بالعموم اور غزل بالخصوص زبان کی کرشمہ کاریوں
کی بہت کچھ رہین منت ہوتی ہے - میں نہیں کہتا کہ اس

رمز سے دوسری زبان والے نا آشنا ہیں۔ میں تو صرف یہ بتانا چاہتا ہوں کہ آردو کے غزل گو اس سے بہت زیادہ آشنا ہیں اور اس میں بڑی مہارت رکھتے ہیں - یہی سبب ہے کہ دور دراز گوشوں میں پھیلی ہونے کے باوجود آردو زبان اور آردو غزل میں نراج نہیں ملتا اور زبان یا شاعری کا معمولی سے معمولی سقم بھی گوارا نہیں کیا جاتا ۔ یہ فیضان غزل کا ہے !

آردو کو ہندوستان کے بازار مصر میں ہر وقت ہر یوسف کا سامنا رہا اس لیے کھوٹے کھرے کا پردہ چلن میں برابر کھلتا رہا ۔ ستم ظریفی یہ ہے کہ اب اسی یوسف کو مصر سے نکال دینے کی فکر ہے جس کا کنعاں اور مصر دونوں ہندوستان ہی رہا ہے -

آردو نے غزل کے درجے کو کتنا بلند کردیا ہے ، ابھی ابھی عرض کر چکا ہوں ۔ اب زبان کے ساتھ اس کا سلوک دیکھیے ۔ سب جانتے ہیں کہ آردو ہندی سے بر آمد ہوئی اور اس کی اصل ہندی ہے ۔ اس نے ہندی کو ایک نیا شعور دیا ۔ ایک نئی شائستگی اور ایک نئی روایت بخشی اور سیستان کے ایک پہلوان کو رستم داستاں بنا دیا ۔ اب دکن میں بھی ہندی کا سراغ آردو ہی کے

وسیلہ سے لگایا جا رہا ہے ۔ آردو نے یہاں کی تہذیب و معاشرت ، وسیع النظری اور بلند حوصلگی پر کیا اثر ڈالا ، یہ بحث اس وقت ملتوی رکھتا ہوں ۔ کہنے کا مطلب صرف اتنا ہے کہ زبان ہو ، ادیب ہو ، تہذیب اور معاشرت ہو ، ان کی توانا اور صحت مند صلاحیت اور امکانات کو ان کی تقدیر سے ہم کنار کرنے میں آردو کا بہت بڑا دخل رہا ہے اور آردو کو ہندوستان گیر بنایا آردو غزل نے !

غزل کے مقبول عام ہونے کے بہت سے اسباب ہیں ۔

ایک تو یہی کہ غزل آسانی سے کہہ لی جاتی ہے اور اسی آسانی سے اس کے سننے اور اس پر سر دھننے والے ہر جگہ مل جاتے ہیں جو ذرا بھی موزوں طبع ہو غزل کہہ لے گا ۔ حسن و محبت کی باتوں اور گھاتوں سے بھی آشنا ہوتے ہیں ۔ خواتین اور خدا جہاں ہوں گے ، اور کہاں نہیں ہیں وہاں غزل خواں بھی موجود ہوگا ۔ بعضوں کا خیال ہے کہ غزل خواں نہ ہوگا تو ترقی پسند ہوں گے اور جہاں کوئی نہ ہوگا نقاد ہوگا !

آپ میرے اس کہنے سے آزردہ نہ ہوں ، میری عادت بری سہی آپ کی طبیعت تو بری نہیں ! میں کہنے یہ جا رہا تھا کہ شاعری بہ حیثیت مجموعی شاعر یا شخص

کے تحت شعور کی غمازی ہے ۔ تحت شعور ہی وہ نقطۂ شعری ہے جو شاعر کی تقدیر بن جاتا ہے ۔ یہ تحت شعور لاہوتی ہو یا ناسوتی اس سے بحث نہیں اس تحت شعور کو کیا اور کیسی صورت دی جاتی ہے اور کیا معنی بخشے جاتے ہیں یہ شخص یا شاعر کی توفیق پر منحصر ہے ۔

شاعر بڑا ہے ، اچھا ہے ، معمولی ہے ، گھٹیا ہے یا کیا ہے ان سب کا دار و مدار اس پر ہے کہ اس نے اپنے تحت شعور کا اظہار کس سطح سے اور کس نیت سے کیا ۔ شاعری خوب کو خوب تر بناتے رہنے کا مشن یا منصب ہے اور کوئی شاعر اس منصب کا اہل نہیں اگر وہ عظیم سے واقف ہو اور حقیر پر اکتفا کرے !

دوسرا سبب اس کی مقبولیت کا یہ ہے کہ غزل کے پیمانے میں جو صہبا ہوتی ہے وہ دو آتشہ سہ آتشہ سے بھی زیادہ آتشہ ہوتی ہے جہاں آبگینہ تندئ صہبا سے پگھلنے لگتا ہے ۔ غزل میں آمیزش کا دخل نہیں ۔ جس کو ایک دوسرے استعارے میں کہہ سکتے ہیں ۔ آمیزش کجا و گہرپاک آں کجا !

ظاہر ہے اس صہبا کا طبائع پر کیا اثر ہوتا ہوگا ۔

تیسری بات غزل کی وہی "آرائش خم کا کل"

اور ہمارے آپ کے ”اندیشہ ہائے دور دراز“ کا قصہ ہے - میں اس استعارے کی وضاحت کرنا نہیں چاہتا تاکہ اس سے وہ لوگ خوش ہوں جو اسے سمجھتے ہوں اور ان سے زیادہ وہ لوگ جو اس کو سمجھ نہ پائیں -

چوتھی بات غزل کا انداز ہے جو دل ہی میں نہیں اتر جاتا بلکہ حافظے پر بھی نقش ہو جاتا ہے - بہترین شعر ایک طور پر وہ ہے جو ضرب المثل بن جائے - سہل ممتنع بھی اسی کا ایک پہلو ہے - کسی شاعر کے مقبول ہونے کی ایک کسوٹی یہ بھی ہے کہ اس کے کتنے اشعار ضرب المثل بن گئے - مسلمہ تجربات اور مسلمہ حقائق کو ایک یا دو مصرعوں میں اس طرح سمو دینا کہ زبان ذوق و ذہن قریب سبھی کی سیرابی ہو جائے ، معمولی کام نہیں ہے -

آردو والے بات بات پر شعر پڑھتے ہیں - اسے آپ جو چاہیں کہہ لیں اس کا سبب یہی ہے کہ غزل نے ہر موقع کے لیے برمحل اشعار اس کثرت سے فراہم کر دیے ہیں کہ ان کا بے اختیار زبان پر آتے رہنا تعجب کی بات نہیں - غزل ضرب الامثال کی دارالضرب ہوتی ہے - بہ الفاظ دیگر غزل ضرب الامثال تصنیف کرنے کی کوشش ہے -

غزل کہنے میں سہولت یہ ہے اور اتنی ہی دقت
بھی کہ جو بات کہنی ہوتی ہے مختصر سے مختصر الفاظ
میں جلد سے جلد کہہ کر ختم کردی جاتی ہے - دوسری
طرف یہ بھی ہے کہ غزل کا شعر بڑے سے بڑے پیمانے
پر پلان کرتے ہیں اور چھوٹے سے چھوٹے پیمانے پر مرصع
و مکمل کرتے ہیں - غزل میں داستان نہیں سناتے تاثیر
دکھاتے یا تجربہ بیان کرتے ہیں - اندرون بینی بیرون
بینی سے اکثر زیادہ آسان ہوتی ہے - اسی لیے اردو میں
اچھی طویل نظمیں اور مثنویاں کم ہیں - اچھی سے اچھی
غزلیں بہت ہیں - اچھے ناول کم اور اچھے مختصر افسانے
زیادہ ہیں - غزل مختصر ترین افسانوں کا مجموعہ ہوتی ہے -
جس میں ہر شعر مختصر ترین اور ساتھ ہی ساتھ مکمل ترین
افسانہ ہوتا ہے -

اب زندگی کی مصروفیتیں اور مطالبات اتنے سریع
اور شدید اور اتنے زیادہ ہوگئے ہیں کہ طویل رزمیہ یا
بزمیہ لکھنا ناممکن ہوگیا ہے اور یہ نہ تعجب کی بات
ہے نہ ماتم کی !

پہلے زمانہ میں ہر چیز آہستہ اور ثابت قدمی کے
ساتھ حرکت کرتی تھی - لوگ اطمینان سے سوچتے تھے

اور جو کچھ طے کر لیتے تھے اس پر تمام عمر یکسوئی اور عقیدت سے کام کرتے رہتے ۔ آج کل کی طرح اس کا اندیشہ نہ تھا کہ کسی وقت زندگی زیر و زبر ہو جائے گی اور سارا کرا کرایا دھرا رہ جائے گا یا کوئی اور آڑا لے جائے گا !

عقیدہ اور یکسوئی کا زمانہ ختم ہو چکا ہے ۔ شاید ہمیشہ کے لیے ۔ اب کوئی رزمیہ کیا لکھے گا اور اس کی ضرورت ہی کیا رہی جب ہر لحظہ ہر طرح کا رزمیہ ہر جگہ وقوع میں آتا رہتا ہے ۔ اور ہمارا ان کا براہ راست مابقہ رہتا ہے یا ان کا حال ہم اخبارات میں پڑھتے ، ریڈیو پر سنتے اور فلم میں دیکھتے رہتے ہیں ۔ اب بڑے سے بڑا حادثہ جلد جلد پیش آتا رہتا ہے اور جلد سے جلد باسی ہو جاتا ہے ۔ مشین کی اعانت مل جانے سے غیر معمولی بھی معمولی ہو گیا ہے اور بزدل کا بہادر اور معمولی کا غیر معمولی پر فتح پانے کا امکان بڑھ گیا ہے ۔ بقول شاعر
ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے !

اب رزمیہ کی جھلک صرف جہاں تہاں ملتی رہے گی اور اندیشہ یہی ہے کہ شاید کوئی مستقل ، مبسوط اور یادگار رزمیہ ظہور میں نہ آئے ۔ اس کی مثال یوں دی جاسکتی ہے ۔ اس صدی میں اقبال سے بڑا شاعر اردو میں

نہیں پیدا ہوا ۔ اقبال کے کلام سے بآسانی اندازہ کیا
جاسکتا ہے کہ وہی ایسے شاعر تھے جو اصلی معنوں میں
کوئی رزمیہ لکھ سکتے تھے ۔ ان کے عہد میں دنیا میں
کیا کچھ نہ پیش آیا اور انہوں نے دور یا قریب سے کیا
کچھ نہ دیکھا یا سنا ۔ لیکن انہوں نے کوئی رزمیہ نہ
لکھی گو ان کی اکثر نظموں میں رزمیہ کی بڑی نمایاں
جھلک ملتی ہے ۔ میرا خیال ہے کہ جو حادثات اقبال
کے سامنے اور آن کے زمانہ میں پیش آئے ، ان میں سے
ایک آدھ بھی پہلے زمانہ میں پیش آتا تو شاید اقبال سے
کم درجہ کا کوئی شاعر بھی کوئی رزمیہ لکھ ڈالتا ۔ دوسری
طرف اقبال باوجود اتنے بڑے شاعر اور حکیم ہونے کے ان
بڑے سے بڑے سا نحات پر صرف مختصر رزمیئے لکھ پائے ۔

سیرت اور شخصیت (اس لئے شاعری بھی) اپنے
نشو و نما کے لئے کافی مدت و مشقت کے علاوہ تھوڑا سا
ایمان بالغیب بھی چاہتی ہے اور یہ چیزیں اب میسر نہیں
ہیں ۔ اس لئے کسی ایسی داستانی نظم کے وجود میں آنے
کا امکان بہت کم رہ گیا ہے جس پر رزمیہ کا صحیح اطلاق
ہوسکے ! البتہ غزل نے ہر تہذیب اور تہلکہ میں ہمارا
ساتھ دیا ہے ۔ وہ ہر تہذیب اور تہلکہ میں ہمارے بعد
آنے والوں کا بھی ساتھ دے گی !

شاعری کا بہت کچھ مدار شاعر کی اپنی واردات کے حسن تعبیر یا حسن اظہار پر ہے - ہئیت موضوع، مواد سب محتاج ہیں ابلاغ کے اور ابلاغ محتاج ہے حسن اظہار کا جو منحصر ہے خلوص اور سلیقہ پر - کسی بات کا شاعر کے دل میں پیدا ہونا اتنا اہم نہیں ہے جتنا اس کا دوسرے کے دل میں آتار دینا - اور دل میں بات آتاری جاتی ہے حسن اظہار سے - شاعری ہو یا تنقید ایک حدتک انفرادی پسند یا ناپسند بھی ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ ایک اجتماعی خدمت یا ذمہ داری بھی ہے - شاعر کا کام صرف متاثر ہونا یا متاثر کرنا ہی نہیں ہے اصلاح نفس اور ارتفاع شخصیت بھی ہے - اپنی بھی دوسرے کی بھی -

ایک شاعر نے اس کا ماتم کیا ہے کہ کتنے بے شمار سخنہائے گفتنی خوف فساد خلق سے ناگفتہ رہ گئے بات پتے کی کہی ہے لیکن میرا خیال ہے کہ فسون شاعری فساد خلق کا سد باب کر سکتی ہے - شعر و ادب میں ہم جس کو ابتذال، برہنگی یا فحاشی کہتے ہیں اکثر وہ شاعر اور ادیب کا عجز اسلوب ہوتا ہے !

شاعری میں حُسن محض کا میں قائل نہیں - میں سرے سے محض کا قائل نہیں ہوں - میں حسن خیال اور

حسن عمل کو بھی ایک دوسرے سے علیحٰدہ دیکھنے سے معذور ہوں ۔ معقول شاعر نا معقول شخص یا نا معقول شخص معقول شاعر کیسے ہوسکتا ہے ۔ ممکن ہے کوئی ہوتا ہو لیکن نہ وہ میرے ذہن میں آتا ہے نہ میرے دسترخوان پر آنے پائے گا !

حسن خیال اور حسن اظہار کی کار فرمائی شاعری ہی میں نہیں ہوتی ، ہر ذہنی مشغلہ میں ملتی ہے ۔ میں ریاضی ، فلسفہ ، سائنس وغیرہ کا طالب علم کبھی نہیں رہا لیکن کبھی کبھی تفریحاً ان کے بعض مستند مصنفین کا سرسری مطالعہ کیا ہے ۔ جہاں کہیں بات سمجھ میں آگئی ہے تو ان کے بات کہنے اور پیش کرنے کے انداز کا اتنا ہی لطف آیا ہے اور بصیرت نصیب ہوئی جتنا غالب اور اقبال کی غزلوں میں !

شاعری زیور کی محتاج ہے ، زیور غزل کا محتاج ہے !

غزل کی موجودہ ہمہ جہتی و ہمہ گیری خوبی اور خوبصورتی بیسویں صدی کے موجودہ پہلے نصف کے اکابر غزل گویوں کا عطیہ ہے ! جو میرے نزدیک حسب ذیل ہیں:

حسرت ، اقبال ، اصغر ، فانی ، جگر اور فراق ۔ اس

پچاس سال کو آردو غزل گوئی کا عہد زریں سمجھتا ہوں ۔

انیسویں صدی میں غزل اور غزل گویوں کا مقابلہ غزل اور غزل گویوں سے تھا بیسویں صدی میں دونوں کا مقابلہ زندگی ، زمانہ اور ذہن کے سیل بے اماں سے رہا ہے۔ گزشتہ پچاس سال میں وہ ایسی مہیب لڑائیاں لڑی گئیں کہ پہلے کا نہ کوئی نادر باقی رہا نہ نادری ؟ مذہب و اخلاق معیشت و معاشرت ، حکومت و سیاست ، شعر وادب فن و حکمت ، سب کے نادر اور نادری زد میں آئی اور زیر و زبر ہوگئی جس کو کس مزے سے ایک شاعر نے بیان کیا ہے ۔

کیسے کیسے ایسے ویسے ہوگئے
ایسے ویسے کیسے کیسے ہوگئے !

لیکن جیسا کہ آپ جانتے ہیں نہ نادر کبھی ختم ہوئے نہ ان کی نادری ۔ صرف ان کی شکلیں بدل جاتی ہیں !

زندگی کی تمام دوسری سرگرمیوں سے قطع نظر میں صرف آردو غزل کو لے لیتا ہوں ۔ غزل کا معمولی طالب علم بھی کچھ نہ کچھ اندازہ لگاسکتا ہے کہ آردو غزل کو اس پچاس سال میں کن دشواریوں اور رسوائیاں کا سامنا رہا ۔ جس میں حالی کی وہ برہمی و بے زاری بھی

شامل ہے جو انھوں نے بیشتر غزل گویوں کے طورطریقوں پر ظاہر کی تھی -

حالی فی نفسہ غزل کے مخالف نہ تھے - اور کیسے ہوسکتے تھے جب وہ غالب اور شیفتہ کے اتنے شیدائی اور فارسی شاعری کے ہر مستی و ہشیاری، ندرت و نزاکت اور رنگ و رامش سے آشنا تھے - ہمارے بعض نقاد تو یہاں تک کہتے ہیں کہ حالی کی غزلوں کا حالی کی نظموں سے پلہ بھاری ہے !

حالی کی غزلوں میں جذبات کی جیسی شائستگی، لہجہ کی نرمی، خیال کی پاکیزگی، بیان کی سادگی اور فن کی پختگی ملتی ہے اور شاعری و شرافت کا جیسا جیتا جاگتا توازن ملتا ہے، وہ مجموعی طور پر کسی اور غزل گو کے یہاں مشکل سے ملے گا - حالی غزل کو ہرزہ سرائی سے پاک کرنا چاہتے تھے - غزل کے اس عہد کی ہرزہ سرائی کا موازنہ آج سے کچھ پہلے کی جدید نظم کی ہرزہ سرائی سے آسانی سے کیا جاسکتا ہے - جو خدا خدا کر کے اب ختم ہوئی ہے جس کا سہرا اس عہد کے سرآمد غزل گویوں کے سر ہے !

تہذیب اور تاریخ کا پورا سواد اعظم حالی نے اپنی آنکھوں کے سامنے مسمار ہوتے دیکھا تھا - اس کھنڈر

پر حالی بے پایاں انسانی دردمندی اور غیرت قومی کے ساتھ کھڑے اپنے ساتھیوں کی غفلت اور خفیف الحرکاتی پر آنسو بہاتے ہیں - سواد رومتہ الکبریٰ میں اقبال حالی ہی کی آواز بازگشت ہیں -

شاعری کا اتنا بڑا کینوس حالی اور اقبال ہی کے بس کا تھا - ہر بڑی تہذیب کے کھنڈر پر کوئی نہ کوئی حالی یا اقبال ضرور نمودار ہوتا ہے - اگر نہ ہو تو اس تہذیب پر فاتحہ پڑھ لینے کے سوا چارہ نہیں - بڑے شاعروں کی شاعری میں تاریخی تہلکے انسانی تہذیب میں ڈھلتے ہیں - شاعری خوانچہ والوں کی پکار نہیں ہوتی ، انسانیت کے خاصان بارگاہ کی فغان ، نیم شبی اور گریہ سحری ہوتی ہے !

حالی غزل کے سارے لوازم برتتے ہیں ، لیکن ان میں سے کسی کو اس کے حدود سے باہر نہیں نکلنے دیتے - حالی غزل ہی نہیں شاعری کے بھی قابو میں نہیں گئے - انھوں نے غزل کو اپنے قابو میں رکھا اور یہ بات معمولی نہیں ہے - جس شاعر ہر فن یا موضوع قبضہ پالے میں اسے بڑا شاعر نہیں سمجھتا ، بڑا شاعر وہ ہے جو فن اور موضوع کو اپنے قبضے میں رکھے اور یہ اس وقت تک ممکن نہیں جب تک شاعر خود اپنے کو قابو میں نہ رکھ سکے !

اردو غزل پر اس زمانے میں جتنے اعتراض کیے گئے اور غزل کو رسوا کرنے کی جتنی کوشش کی گئی اس سے پہلے کبھی نہیں کی گئی تھی ۔ ایک وقت تو ایسا آیا جب یہ فیصلہ کردیا گیا کہ غزل ترقی پسندی کی ضد ہے ۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس زمانے میں اردو شاعری کے قامت پر چست کرنے کے لیے جتنی قبائیں قطع کی گئی یا ان قباؤں پر چست کرنے کے لئے آن کی شاعری کے قامت کی جتنی قطع برید کی گئی وہ شاید اس سے پہلے نہیں ہوئی ۔

بیسویں صدی کی غزل گوئی پر اظہار خیال کرنے سے پہلے کچھ باتیں ذہن میں رکھنی ضروری ہیں ۔ ایک تو یہ کہ آردو غزل کی اہمیت و معنویت دراصل میر سے شروع ہوتی ہے اور غالب تک پہنچ کر اس کے دو دھارے ہوجاتے ہیں !

غالب نے آردو غزل کو ایک نیا شعور ایک نیا نسب اور ایک نیا افق دیا ۔ غالب کے تصرف سے غزل آردو کی تاثیر اور تقدیر بن گئی ۔ انھوں نے نثر اور نظم دونوں کو دلیری بھی دی ، دلبری بھی ۔ غالب نے غزل کی تقدیر دریافت کی اور غزل کو ایسی فضاؤں سے آشنا

کیا جہاں اردو کے تمام ممکنات شعری و شاعری کو برگ و بار لانے کے لیے سامان اور سہولتیں فراہم ہیں۔ انھوں نے اردو شاعری کے سلسلے کو ولی پر ختم ہوجانے کے بجائے فارسی شعرا سے ملا کر رودکی تک پہنچا دیا۔ غالب نے شاعری کے ساتھ وہی کیا جو امیر خسرو نے موسیقی کے ساتھ کیا۔

غالب اور امیر خسرو دونوں ہندوستان اور ایران کی ذہانت و فطانت کے بڑے ممتاز نمائندے تھے۔ انھوں نے دونوں ملکوں کے بہترین کو باہمد گر مربوط، مزین و محکم کیا۔ اگر آپ غالب کے اس کارنامے کو پہچاننا چاہتے ہیں تو حالی اور اکبر کے زینوں سے اقبال تک پہنچنے کی کوشش کریں۔ غالب نے ایسا نہ کیا ہوتا تو اردو شاعری ارباب نشاط اور قوالوں سے آگے نہ بڑھتی۔

غالب سے جن دو دھاروں کے شروع ہونے کا تذکرہ اوپر کیا گیا ہے ان کی تشریح یہ ہے۔ ایک دھارا تو وہ ہے جس میں غزل کم و بیش اپنی روایتی وضع قطع اور سج دھج سے آگے بڑھتی ہے دوسرے دھارے میں غزل وہ رنگ اختیار کر لیتی ہے جو غزل ہونے کے ساتھ ساتھ بہت کچھ اور ہے۔ اس میں غزل، زندگی، زمانہ

اور ذہن تینوں سے ساز و ستیز کرتی آگے بڑھتی ہے اور بالآخر اقبال کی زد میں آ کر شاعری کی "زندہ" رود بن جاتی ہے۔

غالب کے بعد حسرت پہلے شاعر ہیں جن کو میں اردو غزل کا سب سے توانا اور صحت مند شاعر سمجھتا ہوں۔ حسرت کا جسم، جذبہ اور ذہن تینوں ایسے ہیں جو اپنی اپنی جگہ پر ثابت، سالم اور صحت مند ہیں۔ ان میں آپس کی کہیں کھینچ تان نہیں ملتی۔ کسی میں تناؤ نہیں ہے۔ سب اپنی اپنی جگہ پر قابض اور متصرف ہیں۔ یہی سبب ہے کہ ان کے یہاں مفاہمت نہیں ملتی۔ وہ کانگرسی، کمیونسٹ، کمونلسٹ، اشتراکی، صوفی علیحٰدہ علیحٰدہ ہیں۔ ان کے ان رجحانات میں کہیں تصادم نہیں ملتا۔ حسرت کہیں نقاب میں نظر نہ آئیں گے۔ جو شخص اپنی شخصیت کے کسی پہلو کو کمزور نہ سمجھتا ہو وہ نقاب کا محتاج نہیں ہوتا۔ حسرت کا یہی انداز دیکھ کر بعض ناقدوں نے یہاں تک کہہ دیا کہ حسرت کے یہاں کوئی شعری کردار نہیں تھا۔

حسرت کی شاعری عشقیہ شاعری ہے۔ الف سے ی تک! جسم و جمال و جذبہ کی شاعری! حسرت سے پہلے

آردو کا کوئی شاعر ایسا نظر نہیں آتا جس کا محبوب اور
جس کی عشق ورزی اتنی جانی پہچانی ، اتنی شائستہ اور
اتنی نارمل ہو جتنی کہ حسرت کی ۔ انھوں نے اپنی
عاشقی کو قضیۂ زمین برسر زمین ہی رکھا ۔ اس کو نہ
آسمان پر لیے لیے پھرے نہ ویرانوں میں بھٹکنے دیا ۔
انھوں نے اپنے عشق کو نہ گاؤں سدھار کا حیلہ بنایا نہ
بغاوت اور انقلاب کا وسیلہ ، نہ یزداں اور اہرمن کا مسئلہ ۔
حسرت اور جگر اصلاً اسی دنیا کے محبوب اور محبت کے
شاعر ہیں ۔ لیکن ان دونوں میں یہ فرق ہے کہ حسرت
محبوب کی موجودگی میں اور جگر محبوب کی دوری پر
غزلخواں ہوتے ہیں ۔ محبوب کی موجودگی وصال کی محرک
ہوتی ہے ، دوری محبت کی ۔ جگر محبت کے شاعر ہیں ،
حسرت محبوب کے ، اقبال عشق و عمل کے ، فانی الم کے ،
اصغر حسن کے اور فراق ! لیکن فراق کے بارے میں مجھے
کچھ اور بھی کہنا ہے ۔

حسرت کی شاعری نہ ان کے پیچھے روگ بن کر
لگی نہ انھوں نے عاشقی کر کے زمین و آسمان کو مسخر
کرنا چاہا اور نہ دنیا کے تمام علوم و فنون اور کار و بار
کو مردود و معطل کرنے کے درپے ہوئے ۔ نہ وہ کہیں
سسکتے بلکتے ہیں نہ گونجتے گرجتے ہیں ۔ حسرت کی

شاعری اور عاشقی دونوں کے صحت مند ہونے کی دلیل یہ بھی ہے کہ آج تک ان کے ناقدوں کو اس کی ہمت نہ ہوئی کہ وہ حسرت کی شاعری کو سمجھانے کے لیے ہم کو فلسفہ، سائنس اور فنون لطیفہ کے ان اسرار و رموز سے آشنا کراتے جن کو وہ خود بھی جانتے ہوں یا نہیں اس مغالطفہمی میں ضرور مبتلا تھے کہ کوئی اور نہیں جانتا۔

حسرت کی شاعری اور عاشقی کی طرح حسرت کی زبان بھی بڑی معصوم، شائستہ، دل نشیں اور منجی ہوئی ہے۔ زبان و بیان کا جو فطری لطف حسرت کے یہاں ملتا ہے وہ دوسرے کے ہاں تقریباً نہیں ملتا۔

حسرت کا عشق، حسرت کی زبان، حسرت کا لہجہ حسرت کی شاعری کی ساخت پرداخت سب کی سب مفرد ہے مرکب نہیں۔ وہ جڑی بوٹی کے قائل تھے۔ ماء اللحم و کشتہ جات کے نہیں۔ فن اور زبان کی معرفت حاصل کرنے کے لیے حسرت نے اساتذہ کے کلام کا بڑے شوق اور محنت سے مطالعہ کیا اور چھوٹے بڑے شاعروں کے کلام کو مدون کرکے زمانے کی دستبرد سے بچا لیا اور خدمات کے علاوہ یہ کام بجائے خود ان کی زندگی کو بامراد بنانے کے لیے کافی ہے۔ ان کے کلام کے مطالعہ کے

بعد یہ محسوس ہوتا ہے کہ شاعر اور انشا پرداز دونوں کے لیے زبان اور فن کے گہرے مطالعہ کی کتنی ضرورت ہے۔

اردو شاعری اب بہت مشکل ہے۔ اور ہمارے بعض اچھے اور مشہور شعرا کے کلام میں بھی زبان اور فن کی خامی کھٹکتی ہے۔ حسرت کے ہاں زبان و بیان کی ایسی بے ساختگی ملتی ہے کہ ان کے الفاظ و تراکیب کی غرابت اور اچانک پن بھی مزا دے جاتا ہے۔ اکثر یہ اچانک پن ہی حسرت کی نشان دہی کرتا ہے۔ بچوں کی مانند وہ اس درجہ بھولے اور بے تکلف ہیں کہ جابجا ان کا کھیل کھیلنا اور زیادہ بھلا معلوم ہوتا ہے۔ سیدھی سادی بات کو بغیر کسی فلسفہ یا فتور نیت کے مزے سے کہنا اور کہہ ڈالنا حسرت کا حصہ ہے۔ حسرت بات کہہ کر تو خوش ہوتے ہی ہیں، لیکن اس احساس سے اور زیادہ خوش ہو جاتے ہیں کہ ان کی باتوں سے ہم آپ ان سے بھی زیادہ خوش ہوئے۔

اردو شاعروں نے عشق و محبت کی جتنی سختیاں کبھی خواب میں دیکھیں یا اپنے کلام میں جتائیں، ان سے کہیں زیادہ حسرت نے ملک اور وطن کی خاطر قید فرنگ میں اٹھائیں لیکن حسرت کے کلام میں اس کا شکوہ

کہیں نہیں ملتا ۔ حسرت کی شائستگی اور شگفتگی نے ان کا ساتھ کبھی نہیں چھوڑا ۔ حسرت کا کوئی شعری کیریکٹر ہو یا نہ ہو حسرت کے کیریکٹر کا شاعر میرے علم میں نہیں آیا ۔ حسرت کی عاشقی اور شاعری دونوں پیشہ نہیں زندگی کا فطری معمول نظر آتے ہیں ۔

حسرت کے ساتھ میں نے جگر کا تذکرہ چھیڑ دیا تھا ۔ اس لیے اس سلسلہ کو آگے بڑھانے میں کوئی حرج نہ ہوگا ۔ جگر کی شاعری نے ہمارے بعض تنقید نگاروں کو بڑی دلچسپ مصیبت میں مبتلا کر دیا ہے ۔ وہ کبھی غزل کی مذمت کر کے جگر کی مذمت کرتے ہیں اور کبھی کسی شاعر کی مذمت کر کے جگر کی تعریف مثلاً یہ انداز گفتگو:

"جگر داغ کے قبیلے کے آدمی ہیں ۔ فانی اور اصغر یا غالب اور مومن سے کوئی نسبت نہیں رکھتے ۔ جگر سے وہ ذہنیت شروع ہو جاتی ہے جو نئے دور کی اصل روح ہے ۔ جگر کے لہجے میں جو خود یا فتگی اور تڑپ ہوتی ہے اس کا داغ اور داغ کے مدرسۂ شاعری میں پتہ نہیں اور نہ ہوسکتا تھا جگر کی شاعری میں جو رومانی درد مندی ہے وہ کچھ ہمارے ہی دور کی چیز ہے، جگر کی شاعری بہت سطحی شاعری ہے ۔ نامرادی اور بے چارگی احساس نے ان کے وہاں کچھ نئے عنوان کی نرمیاں ضرور

پیدا کر دی ہیں لیکن ادنیٰ درجے کا بوس وکنار اور سستے
قسم کی لذتوں کی ہوس دوسرے شاعروں کی طرح ان کے
ہاں بھی ملتی ہیں !

جگر کے کلام میں ایک تلملاہٹ بھی پائی جاتی ہے
جو ان لذتوں کے میسر نہ ہونے کی وجہ سے پیدا ہوگئی
ہے جس کو انھوں نے اپنے لیے لذت بنا لیا ہے ۔ جگر کی
شاعری میں نفسیاتی مزاحم اور جذباتی رکاوٹوں کا کہیں
پتہ نہیں ۔ جگر عشقیہ زندگی کے عارضی لمحات کے شاعر
ہیں ۔ شاعری کی نوجوان نسل نے جگر سے وہ بے باک
معصومیت اور وہ باغیانہ و سرفروشانہ صداقت از سر نو
پائی جس کی کسی زمانہ میں سعدی کا سا معلم اخلاق قسم
کھا چکا ہے اور جو نوجوانوں سے جاچکی ہے! یا داغ سے جو
ترکہ جگر نے پایا ہے وہ عشق کی آزمودہ کاری ہے ۔ جگر
کے اشعار میں کسی قسم کی گہرائیاں نہیں ہوتیں ۔ ان
کے ہاں ایک تھما ہوا جذباتی ہیجان ضرور ہوتا ہے ۔
جس کو ہم اکثر کیف سمجھ لیتے ہیں ۔ جگر کو حکمت
و اخلاق سے دور کا بھی لگاؤ نہیں ۔ کائنات اور انسانی
زندگی کے اسرار و رموز سوچنے سمجھنے کی نہ ان کے اندر
تاب ہے اور نہ ان کو اس کی فکر کہ وہ زندگی کی ان
گہرائیوں اور بلندیوں کا جائزہ لیں ۔ جگر کی رسائی
فکر و احساس کا دائرہ بہت تنگ ہے ۔ اور ان کے ہاں
موضوع کے اعتبار سے زیادہ تنوع بھی نہیں اس لحاظ سے

وہ اپنے معاصرین مثلاً عزیز، فانی، اصغر وغیرہ کے
مرتبوں کو نہیں پہنچتے۔

جگر کے اشعار میں جو نیا پن ہے اس کا تعلق دراصل
انداز و اسلوب سے زیادہ ہے۔ فکر و احساس سے کم ہے۔
وغیرہ۔"

یہ باتیں اور اس طرح کی باتیں جگر کے کلام پر
صادق آتی ہوں یا نہیں، نقاد کے ذہنی اضطراب و انتشار کی
غمازی ضرور کرتی ہیں۔ جگر ہی کی شاعری پر نہیں، اردو
شاعری پر بھی ہمارے اکثر نقاد اظہار خیال کرتے ہیں
تو بالعموم ان کے سامنے یا تو اقبال کی شاعری ہوتی ہے
یا ترقی پسندی کے نظریے۔ اقبال کی شاعری اور ترقی پسند
نظریے دونوں اپنی اپنی جگہ پر مسلم لیکن یہ کیا ضرور
ہے کہ ہر شاعر انہیں دو حلقوں میں اسیر ہو بالخصوص غزل
گو لیکن اس سے اتنا ضرور ظاہر ہوتا ہے کہ ہمارے ذہن
پر اقبال اور ترقی پسندی کی کیسی مضبوط گرفت ہے۔

ہمارے بعض بڑے ہونہار اور ذی استعداد نوجوان
جن میں تنقید کی اعلیٰ صلاحیتیں ملتی ہیں، ادبی اور فنی
دیانت و امانت کو سیاسی نظریوں پر قربان کر دیتے ہیں۔
سیاسی استیلانے شرفائے ادب کے ساتھ کبھی اچھا سلوک
نہیں کیا۔ میں چاہتا ہوں کہ آرٹ اور ادب کے صحیح

خط و خال اس کے صالح تقاضوں اور قابل قدر کارناموں کو فراموش کر جائیں یا ان کو مسخ کرنے کی کوشش کریں ۔

تنقید نہ یزداں کا فن ہے نہ اہرمن کا وہ انسان کا فن ہے اور انسان کے ادبی کارناموں کے پرکھنے کا فن ۔ پرکھنے میں دیانت ، دانش مندی اور احترام سے کام لینا چاہیئے نہ کہ نالۂ و نفیر سے ۔ شعر و ادب کی دنیا میں نہ ہر مرض کی دوا درود شریف ہے نہ ہر کہ سر بتراشد قلندری داند !

تنقید نگار نہ تو پولیس کے مانند روز نامچے تصنیف کرتا ہے نہ شانہ نشین فرشتوں کے مانند اعمال نامہ مرتب کرتا ہے نہ عدالتوں کی طرح قانون کا منہ تکتا ہے ۔ یہ کیسی تنقید ہے کہ خدا ، پیغمبر ، شریعت ، آشوب حیات ، عذاب قبر اور مواخذہ حشر تو میرا ، اور جنت و جہنم تقسیم کریں تنقید نگار ! ہر اُمت کا حشر اسی کے پیغمبر کے ساتھ اسی کے خدا کے سامنے ہونا چاہیئے ۔ پھر یہ کہاں کی تنقید ہے کہ اکبر الہ آبادی اس لئے ناکام رہے کہ سرسید کامیاب رہے اور سرسید ناکامیاب رہے اس لئے کہ کانگریس کامیاب رہی اور کانگریس ناکامیاب رہی اس لئے کہ چین پر روس کا قبضہ ہوگیا اور روس ناکامیاب رہے گا اس لیے کہ رشید صدیقی غزل پر کچھ فرما رہے ہیں !

میں اپنے اکثر نقادوں بالخصوص غزل کے نقادوں سے کہوں گا،

دل نئہی بخوب ما، طعنہ مزن بزشت ما!

زندگی کا انسانی تصور شرف و منزلت کا تصور ہے۔ مرض و مایوسی کا نہیں میں یہ نہیں کہتا کہ جب ہر طرف آگ لگی ہوئی ہو تو شاعر بانسری بجانے میں حق بجانب ہے۔ لیکن یہ کہنے سے بھی باز نہیں رہ سکتا کہ آگ لگانے یا بھڑکانے کے لیے نقاد یا شاعر کا نفیری بجانا بھی روا نہیں۔

میں کچھ اس کا قائل ہوں کہ شاعر ادیب یا آرٹسٹ نہ زمانے کے پابند ہوتے ہیں نہ زندگی کے نہ نقاد کے! زمانہ، زندگی اور نقاد تینوں شاعر، ادیب اور آرٹسٹ کے منتظر ہوتے ہیں۔ زمانہ ان کا پابند ہوتا ہے وہ زمانے کے پابند نہیں ہوتے۔ اگر شاعر اپنے ماحول کا پابند یا نقاد کی حکم برداری پر مجبور ہو تو شاعری، ادب اور زندگی سے تازہ کاری جو عین زندگی ہے جاتی رہے۔ میرا کچھ ایسا خیال ہے کہ جب تک نقاد فنکار کے برابر یا اس سے بلند نہ ہو اسے تنقید کی ذمہ داری نہ لینی چاہیے۔ اسی طرح جب تک فنکار نقاد کے برابر یا اس سے بلند نہ ہو اس کو

کسی ادبی یا شعری تخلیق کے پیش کرنے میں تامل کرنا چاہئیے - اعلیٰ تنقید ، ہمیشہ اعلیٰ تخلیق سے برآمد ہوتی ہے اور اعلیٰ تخلیقات کا مدار تمام تر اس پر ہے کہ تخلیق کرنے والا کائنات کی عظمت اور فن و زندگی کی اعلیٰ قدروں کا حامل ہے یا نہیں - شعر و ادب کا اعلیٰ مقام وہ ہے جہاں نقاد اور فنکار کو ایک دوسرے سے تمیز کرنا ناممکن ہو جاتا ہے -

میں شاعری میں تجربات کا قائل ہوں لیکن تجربات میں شاعری کا نہیں - میں تجربہ کو تجربہ ہی سمجھتا ہوں الہام نہیں سمجھتا - فن اور زندگی دونوں میں جان تجربہ ہی سے آتی ہے - جو تجربہ سے بھاگے یا تجربہ میں مقید ہوگئے ان کا مستقبل کوئی نہیں - مستقبل کا بذات خود میں کچھ زیادہ شیدائی نہیں ہوں میں تو ماضی کے مستقبل اور مستقبل کے ماضی کا قائل ہوں - میں حال کو ماضی اور مستقبل دونوں سے زیادہ اہم سمجھتا ہوں - ماضی کا اسیر اور مستقبل کا منتظر میں نے ایسوں ہی کو پایا - جن کا ماضی اور مستقبل دونوں مشکوک ہوتا ہے -

شاعری نہ کبھی اصناف سخن میں مقید ہوئی نہ ہوگی - زندگی کے بدل جانے سے شاعری کی ہئیت موضوع اور انداز کا بدل جانا بھی کوئی قیامت نہیں - موضوع اور

ہئیت شاعری نہیں ۔ شاعری کو ہئیت میں محدود کر دینا رسم ہے اور موضوع میں مقید کرنا پروپیگنڈا ۔ مجھے دونوں میں سے کسی ایک پر فخر نہیں !

شاعر کے دل کی واردات خواہ نتیجہ ہوں داخلی محرکات کا خواہ خارجی کا وہ بالآخر ڈھلیں گی انہی شکلوں میں جن کو فنون لطیفہ کہتے ہیں ۔ سہولت کے اعتبار سے فنون لطیفہ کو مختلف خانوں میں بانٹ دیا گیا ہے لیکن ایک حد تک یہ سب گھلے ملے ہوتے ہیں ۔ اگر ان کی تعمیر ایک دوسرے کی رد سے کرنا چاہیں تو کرسکتے ہیں ۔

اس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ہئیت کا تمام تر مدار آرٹسٹ کے موڈ پر ہے ۔ رہا یہ کہ آرٹسٹ اس موڈ کو کس ہیئت کا مرکب دے گا اس کا انحصار اس پر ہے کہ خود آرٹسٹ کس پایہ کا ہے ! آردو شاعری کی ہیئت میں کوئی بڑی تبدیلی کیوں نہ ہوئی یا ہوئی تو اس کو محکمی کیوں نہ نصیب ہوئی اس کا سبب میری سمجھ میں یہ آتا ہے کہ ہیئت کا تجربہ کرنے والے بڑے شاعر نہ تھے یا ہماری شاعری میں ہیئت کی تبدیلی کا تقاضا اتنا قوی نہ تھا جتنا کہ ہونا چاہیے تھا ۔ ہمارے ہاں ہیئت کی تبدیلی کے واقعات تو ملتے ہیں لیکن اس تبدیلی کے پیچھے کوئی بڑا شاعر یا شاعری نہیں ملتی جس کے بغیر

نہ ہئیت کو استحکام نصیب ہوتا ہے نہ خود شاعری کو!

آردو میں بڑے بڑے شاعر پیدا ہوتے رہے لیکن ان میں کوئی آردو شاعری کی ہئیت بدلنے کے درپے نہ ہوا ۔ اس کا ایک سبب یہ ہوسکتا ہے کہ ہمارے بڑے شاعروں میں فنون لطیفہ بالخصوص موسیقی کا (سوا شبلی اور غالباً اقبال کے) ماہر کوئی نہ تھا ۔ یا یہ کہ ہمارے شاعر اپنی شاعری کو موسیقی کا پابند نہیں رکھنا چاہتے تھے ۔ یا شاعری کے لئے موسیقی کو اتنا ضروری نہیں سمجھتے تھے ۔ یہ میں اس لئے کہہ رہا ہوں کہ ہمارے معتبر شاعروں نے شاعری کو گانے سے زیادہ تر الگ ہی رکھا ہے ۔ خسرو اپنے عہد سے لے کر آج تک موسیقی اور شاعری دونوں کے سب سے بڑے امام مانے جاتے ہیں ۔ ان کے ہاں بھی شاعری اور راگنی علیحدہ علیحدہ ہیں ۔ فنی اعتبار سے انہوں نے دونوں کو یکجا کرنے کی کوشش نہیں کی ، حالانکہ ان کو ہر طرح سے اس کا حق پہنچتا تھا !

آردو شاعری ہندوستانی گیتوں سے بے تعلق رہی ۔ البتہ ہمارے گانے والوں کا کمال یہ رہا ہے کہ وہ غزل کو ہندوستان کی راگ راگنیوں میں بڑی خوبی سے ڈھال لیتے تھے ۔ عام طور پر اب بھی گانے میں غزلیں اکثر کام میں لائی جاتی ہیں ۔ ممکن ہے اس کا سبب یہ ہو کہ ہمارے

شاعر موسیقی کا احترام تو کرتے ہوں ۔ لیکن موسیقی کا پابند نہیں ہونا چاہتے ہیں ۔ شاعری اور موسیقی بجائے خود ایک دوسرے کی دست نگر بھی نہیں ہیں ۔ موسیقی اور شاعری کا باہمد گر رشتہ کچھ ہی ہو دونوں کی ذمہ داریاں علیحٰدہ علیحٰدہ ہیں ۔

فلم کے تقاضوں کی بنا پر اردو میں گانے کی نئی دھنیں وجود میں آتی رہیں اور آتی رہیں گی ۔ اسی طرح مختلف استعداد کے شعرا کبھی معذوری اور کبھی ضرورت کی بنا پر ہماری شاعری کی ہئیت بدلتے رہیں گے جیسا کہ اب تک ہوتا چلا آیا ہے اس میں کوئی ہرج نہیں ۔ بے قافیہ نظمیں ہوں یا نظم معرا ۔ یہ ہماری شاعری میں دخیل ہوچکی ہیں اور دخیل ہوتی رہیں گی ۔ ان میں اچھی بری سبھی طرح کی ہیں لیکن مجھے شبہ ہے کہ اب تک ان میں کوئی ایسی نظم بھی لکھی گئی جو اردو کی مشہور نظموں کی ہم پایہ ہو !

موسیقی بڑا مشکل اور ریاض کا فن ہے ۔ قدیم زمانہ میں اس کو دیوتاؤں کا فن اور فریضہ قرار دیا گیا اس لئے کہ وہی ان آوازوں کو صحیح مخارج سے نکال سکتے تھے جو موسیقی میں درکار ہوتے ہیں ۔ عورتوں اور عوام کے بارے میں خیال کیا جاتا تھا کہ طبعی ساخت یا ذہن اور

اخلاق ساخت پرداخت کے اعتبار سے وہ ایسے نہ تھے کہ
ان راگوں کا حق ادا کرسکتے - لیکن رفتار سے جب یہ
دیکھا گیا کہ یہ پابندی زیادہ دنوں قائم نہ رہ سکے گی
تو کچھ آسان دھنیں یا راگنیاں ایجاد کر دی گئیں تاکہ
ان کی خواہش بھی پوری ہوسکے - ہندوؤں میں ذات پات
کے نظام کے بارے میں اب جو چاہے کہہ لیا جائے لیکن
آج سے ہزارہا سال پہلے کے معاشرہ میں بڑی قدروں کی
حفاظت کا اس سے بہتر کوئی اور طریقہ جلد سمجھ میں بھی
نہیں آتا کہ یہ کام صرف بہترین قبیلوں کے سپرد کر دیا
جائے - مذہب برہمنوں کی اور جنگ راجپوتوں کی ذمہ داری
تھی - دونوں فرائض سب سے گراں قدر تھے اس لئے سب
سے اونچے طبقہ کے سپرد کر دیے گئے - ہیئت کا شاعری
میں یہی حال ہوا -

سائنس اور نفسیات نے ہمارے ذہن و فکر کو نئی
وادیوں اور نئے زاویوں سے روشناس کرایا ہے - نئی حقیقتیں
برابر سامنے آرہی ہیں - جنھوں نے جانی پہچانی حقیقتوں
کو کہیں زیادہ اُجاگر کر دیا ہے کہیں ان کو پیچھے
ڈھکیل دیا ہے اور کہیں کہیں ختم کر دیا ہے - زندگی ،
ادب ، شاعری ، مصوری ہر جگہ یہ اثرات نمایاں ہیں -
مصوری اور شاعری کا نیا انداز دیکھ کر ہم بدکتے ہیں ،

بڑ بڑاتے ہیں ، اس سے کام نہ چلے گا - ہم نے حسن کو
اپنی پسند اور ناپسند کی باندی بنا لیا ہے لیکن نہ حسن
مقید ہے نہ انسان کی پسند یا ناپسند - اس لئے پسند یا
ناپسند کے معاملے میں ہم کو احتیاط و انصاف کو ہاتھ سے
نہ دینا چاہئے - کائنات کا حقیر اور گمنام ترین جزو بھی
اتنا ہی عظیم نا قابل فہم اور نا قابل تسخیر ہے جتنا کہ
یہ پورا کارخانۂ قدرت ، ہر چیز حسن بھی ہے اور قانون بھی -
اس حسن و قانون کو سمجھنے کی کوشش کرنا چاہیے -

بڑی شاعری شاعر کا انفرادی لازوال کارنامہ ہوتا
ہے برخلاف سائنس کے کارناموں کے جو مشترکہ محنت و
تحقیقات کا نتیجہ ہوتے ہیں - ایٹم بم بنانے میں معلوم نہیں
کتنے سائنسداں اور سائنس کے کارپرداز برسرکار رہے ہوں
گے لیکن اقبال کی نظم تنہائی ، مسجد قرطبہ اور ساقی نامہ
صرف اقبال کے کارنامے ہیں - میرا مقصد یہاں سائنس کی
اہمیت و عظمت سے انکار نہیں ہے شاعر کی انفرادیت اور
اس کے منصب کا جتانا ہے -

مذہب و اخلاق کی پیروی جتنی مشکل ہے ، اس
سے کہیں زیادہ نفع ان کے بیچ کھانے میں ہے - کسی قوم
یا شعر و ادب کا مطالعہ اس نقطۂ نظر سے کیا جائے تو
معلوم ہوگا کہ وہ قوم یا اس کا شعر و ادب منزلت یا

مذلت کے کس درجے پر ہے۔ ہم میں ایسے لوگوں کی کمی نہیں جو یہ سمجھتے ہیں کہ ادب اور زندگی کی حرمت سے کیا حاصل جب ان دونوں کے بیچ کھانے میں نفع ہے۔ صنعتی تہذیب اور معاشی بحران میں ایسا ہونا تعجب کی بات نہیں۔ تعجب اس کا ہے کہ صنعتی تہذیب اور معاشی بحران کو انسانیت کا تقاضا یا تہذیب کا محور یا منتہا قرار دیا جائے۔

دنیا کتنی ہی تیزی سے آگے کیوں نہ بڑھ رہی ہو انسان کا ذہن ہمیشہ اس سے آگے ہوتا ہے انسانی ذہن اپنے کارنامے پیچھے چھوڑتا ہوا آگے بڑھتا ہے۔ وہ ان کارناموں میں نہ پناہ لیتا ہے نہ ان کو پناہ دینے کی خواہ مخواہ کوشش کرتا ہے۔ اچھے اور بڑے کارنامے اپنی حفاظت خود کرتے ہیں۔

فطرت (نیچر) افراد کا بالکل نہیں لیکن نوع کا احترام ضرور کرتی ہے۔ اس کے برخلاف آرٹ اور ادب نوع (اصناف) کا احترام نہیں کرتے افراد (آرٹسٹ اور ادیب) کا کرتے ہیں۔ فن ہو یا زندگی منتخب افراد ہی کے ذوق و ذہن کے مرکب پر سوار ہو کر آگے بڑھتی ہے۔ ان کے لیے اب تک کوئی اور مرکب دریافت نہیں ہوا۔ قدیم ہو یا جدید اپنے اظہار و اقتدار کے لیے فرد کا محتاج ہے

کسی اور کا نہیں فرد کی اہمیت سے انکار کرنا جہالت بھی ہے ظلم بھی !

خارجی حالات و حوادث سے موجودہ غزل گویوں میں جگر سے زیادہ براہ راست متاثر ہونے والا شاید ہی کوئی اور ہو۔ جگر میں یہ بات آج سے نہیں مدتوں سے ہے۔ انھوں نے ہر بڑے حادثے کا اظہار اپنے کلام میں کسی نہ کسی شکل میں اکثر کیا ہے! کچھ دنوں سے ان کے کلام میں اثر پذیری کی یہ زیریں لہر اور ابھر آئی ہے۔ غزل میں یہ چیز شروع تو حسرت سے ہوئی لیکن حسرت کے ہاں اس کی حیثیت خبر کی ہے اور جگر کے ہاں نظر کی !

عاشقی میں جگر دوری و مہجوری کی عظمت کے قائل ہیں۔ کم سواد شاعروں کے خلاف وہ ہر قیمت پر اصل کے خریدار نہیں ہوتے۔ جگر متاع اور بہا کے نازک اورگراں بہا رشتے کو خوب سمجھتے اور نباہتے ہیں۔ جگر میں بے پایاں سرشاری اور سرفروشی کے ساتھ جو حکیمانہ بصیرت ملتی ہے وہ ان کی شخصیت کو دلاویز اور محترم بنا دیتی ہے۔ غالب نے سب سے پہلے نہایت واضح طور پر عاشقی کی سطح کو اونچا کیا۔ تہذیب رسم عاشقی حسرت کے یہاں غالب سے آئی جسے جگر نے تادہب رسم

عاشقی تک پہنچا دیا ۔ لیکن غالب کے بارے میں یہ
بات بھی سوچنے کی ہے کہ ان کی شاعری میں کوئی محبوب
ہے بھی یا نہیں ۔ غالب اور اقبال ان شعراء میں ہیں جن
کا گوشت پوست کا کوئی محبوب نہیں ۔ اصغر اور فانی کے
ہاں بھی محبوب کا خانہ خالی ہے ۔ اس کا سبب غالباً یہ ہے
کہ بڑے شعراء خود اپنے جسم و جان کی حدود سے نکل کر
حسن و حقیقت کی تلاش میں سر گرم سفر ہوجاتے ہیں ۔

اب تک یہ روایت چلی آتی تھی کہ شعرا عاشق
کے جذبات و احساسات کی ترجمانی کرنے پر پورا زور صرف
کر دیا کرتے تھے ۔ جگر کے ہاں محبوب کے جذبات و
احساسات کی بھی ترجمانی ملتی ہے یہی سبب ہے کہ جگر
عشق کے غلبہ میں محبوب کی صفت کو کبھی فراموش نہیں
کرتے ۔ ہمارے عام شعراء کے محبوب جس انداز کے ہوتے
ہیں ان کو اپنانے کی خواہش ہم میں آپ میں مشکل سے
پیدا ہوگی ۔ہر شاعر اپنے محبوب سے پہچانا جاتا ہے ۔ اردو
غزل کو یہ زاویہ جگر نے دیا ۔

اس خیال کو ذہن میں رکھ کر آپ جگر کا داغ
سے موازنہ کریں تو معلوم ہوگا کہ داغ اور جگر کی عاشقی
کی سطح کیا ہے ۔ دونوں اپنے اپنے محبوب سے پہچانے
جاسکتے ہیں !

جگر کو اصغر سے بڑی عقیدت ہے لیکن شاعری میں وہ اصغر سے بالکل علیحدٰہ ہیں ، اصغر سے ان کا شغف شخصی ہے شاعرانہ نہیں ۔ جیسا حالی کا غالب سے تھا ۔ اصغر کے ہاں تخیل زیادہ جذبہ کم ہے ، جگر کے ہاں جذبے کی لذت ہے اس لئے تخیئل کی کمی ۔ اصغر کے ہاں اصطلاحی تصوف نہیں ہے شاعرانہ تصوف ہے ۔ وہ تصوف کے زور پر یا تصوف کے لئے شاعری نہیں کرتے بلکہ شاعری کی آرائش جمال کے لئے جابجا تصوف کی مشاطگی قبول کر لیتے ہیں ۔ اونچے درجے کے حسن و محبت کی شاعری یوں بھی تصوف معلوم ہونے لگتی ہے ۔

اصغر نے اپنی حسن کار شاعری یا شاعرانہ حسن کاری میں تصوف سے بھی کام لیا ہے ۔ لیکن صرف اُس حدتک جس حدتک ان کا تصوف ان کے شاعرانہ مقصد کے لئے کارآمد ہوسکتا تھا ۔ اُردو شاعری میں تصوف کو اصطلاح و اعتقاد کے دائرہ سے نکال کر حسن آفریں اصغر نے بنایا ۔ اصغر طبعاً صوفی نہیں شاعر ہیں ۔ اصغر کے کلام میں ان کے عہد کی سرگرمیوں کے بڑے حسین اشارے ملتے ہیں ۔ اصغر کے تخیل میں شائستہ رنگینی اور رنگین شائستگی ملتی ہے جس نے ان کے تاثرات کو دل آویز بنا دیا ہے ۔ حسرت نے اپنے رعنائی خیال کی طرف اشارہ کیا ہے ۔ لیکن

میرا خیال ہے کہ دراصل اصغر کے ہاں خیال کی رعنائی ہے اور حسرت کے ہاں جذبات کی رنگینی ! جدید غزل تصوف سے تقریباً خالی ہوچکی ہے۔ روایتی تصوف پر اقبال نے بڑی کاری ضرب لگائی۔ اور میں کچھ ایسا محسوس کرتا ہوں کہ آیندہ شاعری میں تصوف کی کارفرمائی نہ رہے گی ! یوں بھی بیداری اور برہمی کے عہد میں تصوف کا بازار مندا رہتا ہے !

فانی کے غم و الم کی مختلف تعبیریں کی گئی ہیں۔ جوش نے فانی کی شاعری اور خود فانی کے بارے میں بڑی نا ملائم باتیں کہی ہیں۔ فراق نے فانی کے غم میں عظمت عالم گیری ، اور پایندگی دیکھی ہے۔ جگر نے ان میں میر کا سوز و گداز، غالب کی رفعت ، فکر و نظر اور مومن کے انداز کا بانکپن پایا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ میر کے یہاں عاشق کا سوزوگداز یا حرماں نصیبی ملتی ہے۔ فانی کے یہاں آلام حیات کی تفسیر ہے۔ فانی زندگی کو ایک مسلسل اور منظم الم قرار دیتے ہیں۔ وہ الم جس نے بدھ کو نجات کا متلاشی بنایا اورجس کی نشان دہی مسیح کی صلیب کرتی ہے !

مسرت و الم کا مسئلہ ابدی ہے۔ دنیا کے بہترین ذہن و دماغ اس مسئلہ کی تعبیر پر مرکوز رہے اور رہیں گے۔ لیکن اس مسئلے پر یہاں غور کرنے کی اتنی ضرورت نہیں ہے کہ غم کیا ہے کیوں ہے۔ اور اس سے نجات کی

صورت کیا ہے - ہم کو تو یہ دیکھنا ہے کہ ہماری شاعری میں اس کا مقام کیا ہے - ظاہر ہے کہ اس کا بڑا مقام ہے اس لئے کہ دنیا میں غم و الم سے مسلسل سابقہ رہتا ہے اور اکثر و بیشتر اسی کو فتح نصیب ہوتی ہے - اتنی بڑی بات شاعری میں کیوں نہ جگہ پائے گی -

فانی کا شاعری میں تنہا غم کو موضوع سخن بنا لینا کوئی بری بات نہیں - لیکن اس غم کو اس درجہ یکسو و یکساں بنائے رکھنا قابل توجہ ضرور ہے - فانی کا غم متحرک نہیں مجہول ہے - فانی کو موت کا عرفان دوسرے راستوں سے نہ ہوا غم کے راستہ سے ہوا اس میں کوئی مضائقہ نہیں لیکن غم یہ ہے کہ انھوں نے موت کو اس درجہ بے جان کیوں قرار دے دیا - غم اور موت شاعری کے بہت بڑے موضوعات ہیں لیکن فانی کو شاعری میں یہ اتنے بڑے نظر نہیں آتے !

فانی کی زندگی کا کافی حصہ خوشی اور خوش حالی میں گزرا ہے - ماحول و معاشرت کی زبونی کا کوئی عمل دخل ایسا نہیں ملتا جس نے ان کے ذہن یا زندگی کو متاثر کیا ہو سوا زندگی کے آخری زمانے کے جو حیدرآباد میں گزرا - لیکن ان کی شاعری اس سے بہت پہلے شروع ہوچکی تھی - کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ان کی غم ناکی

اور الم‌اندوزی پر خارجی حالات و حوادث کا زیادہ اثر نہیں ہے ۔ ان کی زندگی کی افتاد ہی غم تھی ۔ فانی غم کی دنیا میں نہ تھے غم کی دنیا سے تھے ۔

فانی کے غم سے چونکنے کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ ہماری شاعری میں غم کا ذکر اکثر روایتی یا شاعرانہ رہا ہے ۔ سوا اس غم کے جو ہم کو میر کے ہاں ملتا ہے ۔ لیکن جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں ، میر کا غم عاشقی کا غم ہے ، محبت میں ناکامی کا غم ہے ، یہی غم جیسا کہ غم کا دستور ہے کہیں کہیں زندگی کا غم بن گیا ہے ۔

غالب کے کلام میں بھی غم کا عنصر ملتا ہے ۔ لیکن ان کی شاعری غم کی شاعری نہیں ہے ۔ ان کی شاعری میں عشق و محبت کی بھی وہ نوعیت نہیں ملتی جو دوسرے غزل گویوں کے یہاں بالعموم ملتی ہے ۔ غالب الم سرشت نہ تھے ۔ لیکن جیسا کہ بڑے ذہنوں کا خاصہ ہے کہ وہ زندگی کے ہر بڑے مسئلے کا احاطہ کرتے ہیں غالب کا ذہن آلام حیات پر بھی مرکوز ہوا ہے ۔ غالب کے سامنے الم سے کہیں بڑے مسائل تھے قید حیات و بند غم کی نوعیت غالب اور فانی کے یہاں جداگانہ ہے ۔ غالب کے یہاں ان کی نوعیت مسئلہ کی ہے فانی کے یہاں

مقدر کی ۔ جہاں غالب سفینہ کے کنارے پر آلگتے اور ستم و جور ناخدا کا ذکر کرتے ہیں وہاں وہ زندگی کی نامرادی پر اتنا زور نہیں دیتے جتنا ناخدا کی بےمہری اور فرض ناشناسی پر !

غالب کے اس مصرعہ پر لوگوں نے کم توجہ کی ہے ،

بہت سہی غم گیتی شراب کم کیا ہے !

زندگی کے آلام کو غالب زندگی کے انعام سے کم اور کمتر قرار دیتے ہیں ۔

دوسری بات یہ ہے کہ ، جو لوگ اردو شاعری میں داغ اور میر کا رنگ دیکھ چکے تھے وہ فانی کے غم کی تاب کیسے لا سکتے تھے جیسے غالب کی شاعری سے غالب کے زمانے میں ، اقبال کی شاعری سے اقبال کے زمانے میں اور کسی حد تک فراق کی شاعری سے آج کل لوگ چونکتے ، چراغ پا ہوتے ہیں !

شاعری میں غم کے عنصر کو میں بڑی اہمیت دیتا ہوں غم ہماری زندگی میں پیوست ہے غم اور غم گینی ، شاعری اور موسیقی کو تاثیر بخشتی ہے لیکن بذات خود میں غم کا زیادہ قائل نہیں ہوں ۔ زندگی ، ادب ، آرٹ غرض ہر عظیم انسانی سرگرمی کو روشنی ، رہبری اور

رفعت اُمید سے ملتی ہے ، الم سے نہیں ۔ غم انسانی چیز ہے لیکن انسان غم سے بڑا ہے ۔ میں غم کی عظمت و ابدیت سے زیادہ انسان کی عظمت و ابدیت پر ایمان رکھتا ہوں ۔ خدا اور انسان دونوں ابدی ہیں اور خدا یقیناً غم نہیں ہے ۔

زندگی کو مرض اور مایوسی سے تعبیر کرنے والوں کی کمی نہیں ہے ۔ میں خود زندگی کو یکسر عیش و فراغت نہیں قرار دیتا ۔ لیکن زندگی فی نفسہ مرض اور مایوسی کی نفی کرتی ہے اور یہی سبب ہے کہ ابتدائے تہذیب سے آج تک طرح طرح کی مزاحمتوں کے باوجود اچھے اور اولوالعزم انسان زندگی کو بامعنی و بابرکت بنانے اور رکھنے میں کوشاں اور کامیاب رہے ہیں اور یہ انہیں کا فیضان ہے کہ زندگی اور زمانہ انسان کی تعمیری و تخلیقی سرگرمیوں سے مالامال رہا ہے ۔

میں زندگی اور فن دونوں کا جواز اُمید میں پاتا ہوں ، الم میں نہیں ! فانی کی شاعری موت و الم کی شاعری ہے ۔ لیکن موضوع سے قطع نظر ان کی غزلیں بجائے خود بڑی پاکیزہ اور نوک پلک سے آراستہ ہوتی ہیں ۔ فانی کے ہاں فن اور زبان کا بڑا احترام ملتا ہے ۔ ان کے لہجے میں

بڑی استواری اور ہمواری ہے - کبھی کبھی ان کی حزیں شرافت ان کی حزیں شاعری سے بڑی معلوم ہونے لگتی ہے -

فراق کے بارے میں کچھ غلط فہمیاں ہیں جن کا دور کرنا ضروری ہے - فراق کو میں اس صدی کے موجودہ پچاس سال کے منفرد اور ممتاز غزل گویوں کی صف میں جگہ دیتا ہوں - غزل کا آیندہ جو رنگ و آہنگ ہوگا اس کی ساخت پر داخت میں فراق کا بڑا اہم حصہ ہوگا !

فراق کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ زبان اور فن کے ساتھ بے محل بے تکلفی برتتے ہیں اور مذاق سلیم کا پاس نہیں کرتے - ان کے ہاں فحاشی برہنگی ملتی ہے - وہ اشعار میں صوتی ہم آہنگی کی اہمیت نہیں پہچانتے وغیرہ ایسا کیوں ہے ؟

ان اعتراضات کو سمجھنے کے لئے فراق کو سمجھنا پڑے گا - اول یہ کہ فراق سے زیادہ کھڑی بولی ، برج بھاشا اور اودھی کا بھید بھاؤ اور بناؤ سنگار سمجھنے والے بہت کم اردو شعراء ہمارے ہاں ملتے ہیں - دوسری طرف فراق فارسی ، عربی کے بھید بھاؤ سے اور بناؤ سنگار سے اتنے واقف نہیں جتنے ہمارے دوسرے اردو شعراء ہیں اس لئے فراق

کا لہجہ جانا پہچانا ہونے کے باوجود ہم کو آ کھڑا آ کھڑا سا معلوم ہوتا ہے۔

دوسرے یہ کہ فراق ہندو دیو مالا کے صورت و معنی کے رمز آشنا ہیں، ہندو فلسفہ، مذہب اور روایت پر بھی عبور رکھتے ہیں اور ہندوستان کے رقص اور موسیقی کے بھی رسیا ہیں ایسے رسیا کہ ان کی علمی و ادبی تنقیدوں میں بھی یہ رنگ واضح طور پر جھلکتا ہے۔

تیسرے یہ کہ ہندو مذہب و اخلاق میں مرد اور عورت کے جنسی روابط کی طرح طرح سے تقدیس کی گئی ہے۔ مرد اور عورت کے جنسی اتصال کا تصور ہندو مذہب و اخلاق میں عریانی یا عیاشی کا نہیں جتنا عبادت اور عقیدت کا ہے۔ جس کے مظاہر بعض مندروں کی نقاشی یا مجسموں میں ملتے ہیں۔ ہندوستان میں عبادت کی زبان موسیقی رہی ہے۔ یہاں تک کہ بعضوں کے نزدیک خود موسیقی کو عبادت کا درجہ دے دیا گیا۔

چوتھے یہ کہ انگریزی شعر و ادب، تاریخ و تنقید فراق کا اوڑھنا بچھونا رہا ہے۔ وہ ان کے رگ رگ سے آشنا ہیں۔ انگریزی شعراء اور ارباب فکر کا مطالعہ ان کے کلام میں نمایاں ہے۔ فراق کے کلام میں شعوری یا

غیر شعوری طور پر ان تمام عوامل کی کارفرمائی ملتی ہے۔
کہیں کسر و انکسار کے بعد کبھی کھینچ تان کے ساتھ !

جن الفاظ پر ہم چونکتے ہیں وہ کھڑی بولی ،
برج بھاشا اور اودھی کے تقاضے ہیں "ٹھیٹ ہندی الفاظ
روزمرہ ٹکسالی بولی اور محاروں" کو فراق نے جیسا کہ
وہ بتاتے ہیں کثرت سے اردو میں داخل کیا ہے ، اردو
شعر و ادب کے حق میں یہ فال نیک ہے۔ متقدمین میں
شعراء آردو کے سامنے بھی یہ منزل آئی تھی لیکن اس
زمانے میں شاعری کے فقہا زیادہ تھے مجتہد کوئی نہ تھا۔
اس لئے اس کا جو کچھ انجام ہوا وہ ہم کو معلوم ہے۔
اب جو منزل فراق کے سامنے ہے وہ جانی پہچانی ہونے کے
باوجود دشوار تر اور نازک تر ہے۔

امید کی جاتی ہے کہ فراق کے سامنے زبان ہی کا
مسئلہ نہ ہوگا ، غزل کے آداب محفل کا بھی ہوگا۔ غزل
میں حشر اجساد (قیامت) کا جب ذکر چھڑے گا بات آردو
کی جوانی (غزل) تک ضرور پہنچے گی (۱) !

شاعری بالخصوص غزل میں الفاظ محاورہ اور بولیوں
کی آبادکاری اس طرح تو نہ ہوگی جس طرح ہندوستان
اور پاکستان میں مہاجرین کی ملکیت تقسیم ہوئی ہے یا

---

(۱) ذکر جب چھڑ گیا قیامت کا بات پہنچی تری جوانی تک

غزل کی قامت پر چست کرنے کے لیے جو پیرہن فراق تیار کریں گے ، اس میں دامن کے چاک میں و گریباں کے چاک میں کوئی فاصلہ نہ رکھیں - یہ سب میں اس لیے کہہ رہا ہوں کہ فراق غزل کے ''فنون لطیفہ'' سے واقف ہیں ان سے انحراف کیسے کریں گے -

زبان کے معاملے میں فراق کچھ دنوں سے مجذوب ہو چلے ہیں - مجھے یقین ہے کہ وہ شریعت کے اس قانون سے بھی واقف ہوں گے کہ مجذوب ہوش میں نہ آئے تو اسے قتل کر دیا جائے ! میرا خیال ہے کہ وہ مصلح کو مجذوب پر ترجیح دیں گے -

فراق کی غزلیں طویل ہوتی ہیں - یہ رنگ انھوں نے لکھنؤ کے غزل گویوں سے لیا ہے - ان کی اکثر غزلیں دورازکار قوافی سے بوجھل ہو گئی ہیں - فراق جیسے انگریزی شعر و ادب اور اردو غزل کے رمز آشنا کے بارے میں یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ وہ مشکل اور مہمل قوافی ''باندھنے'' کا کرتب دکھاتے ہیں - لیکن یہ بات دل میں ضرور آتی ہے کہ ان پر بسیارگوئی غلبہ پانے لگی ہے - وہ غزل میں Pre-Pressurised Process (۱) کے نکتہ

---

(۱) Pre-Pressurised کا چلتا ہوا ترجمہ میں فشار یافتہ یا فشار آزمودہ کروں گا -

کو نظر انداز کر دیتے ہیں ۔ اس سے کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے فراق غزل سے تو شروع کرتے ہیں لیکن بھٹکنے لگتے ہیں کہیں اور !

فراق کے یہاں ہم جس چیز کو برہنگی اور فحاشی قرار دیتے ہیں وہ دراصل ان کے تحت الشعور میں مذہبی تقدس کا رنگ رکھتی ہے یہ اور بات ہے کہ وہ کہیں کہیں اس راستے سے بھٹک گئے ہیں ۔ جہاں عورت کا بیچ ہو وہاں بھٹکنا تعجب کی بات نہیں ۔

ہندو مذہب اور شعر و ادب میں عورت کا تصور جنسی آسودگی ، عیاشی یا اوباشی کا نہیں ہے ہندی شاعری میں محبت کا اظہار عورت (بیوی) کی طرف سے ہوتا ہے اور یہ اظہار ہمیشہ درد مہجوری کا ہوتا ہے ۔ طلب وصال کا نہیں ۔ مرد کی طرف سے اظہار محبت ہونے میں محبت کے آداب میں خلل پڑنے کا امکان رہتا ہے ۔ جس کی مثالیں ہماری شاعری اور افسانوں میں کثرت سے ملتی ہیں ۔ محبت کے عواقب مرد سے کہیں زیادہ عورت کو بھگتنے پڑتے ہیں اس لیے عورت فطرتاً محبت کے کاروبار میں زیادہ احترام اور اعتدال سے کام لیتی ہے ۔

فراق اکثر اس امر کا اعلان کرتے رہتے ہیں کہ وہ اپنی شاعری میں قدیم اور عظیم آریائی تہذیب

و تصور کی جمال آرائی کرتے ہیں ۔ اُردو شاعری کے لئے
میں اسے بہت بڑی بشارت سمجھتا ہوں ۔ اُردو اس کی
مستحق اور منتظر بھی ہے ۔ لیکن یہ اتنی بڑی بشارت
ہے کہ اس کے پوری ہونے کی طرف سے میں اکثر
مشتبہ رہتا ہوں ۔

تہذیب کو شاعری یا شاعری کو تہذیب میں
ڈھالنے کے لئے بہت سی منزلیں طے کرنی پڑتی ہیں ۔
اور یقیناً "اس میں دو چار بڑے سخت مقام آتے ہیں"
فراق کی شاعری میں عورت کا ضرورت سے زیادہ عمل
دخل ہے ۔ جیسے یہ طلب کبھی آسود نہ ہوئی ہو ۔
عاشقی اور شاعری کے بہت سے پہلو ہیں ۔ ان میں
مقبول عام وہ ہے جہاں عاشقی اور شاعری کا محور عورت
کا جسم و جمال ہو ۔ اس طرح کی شاعری کا بھی ایک
مقام ہے ۔

لیکن یہ وہ مقام بلند نہیں ہے ، جہاں سے کسی
تہذیب یا تاریخ کا پورا سواد اعظم بڑے شاعر اور اس کے
مخاطب کی آنکھوں کے سامنے آسکے ۔ یہ سواد اعظم بڑے
شاعر کے بطون میں تہلکہ بن کر اُترتا ہے ! اور طوفان
بن کر برآمد ہوتا ہے ۔ یہ طوفان جذب و جنون کا ہوتا
ہے ۔ عورت کے جسم و جان کا نہیں ۔

شاعر کس طرح تہذیب کو شاعری اور شاعری کو تہذیب میں تحویل کرتا ہے ، اس پر منحصر ہے کہ شاعر خود ایمان و عمل کی کس منزل میں ہے ۔ زندگی اور فن کی اعلیٰ قدروں کا کہاں تک حامل ہے ، زبان پر کیسی قدرت رکھتا ہے نیز تہذیب اور شاعری کا اس کا تصور مولویانہ ہے یا مجتہدانہ ! پھر اس اصول کا لحاظ رکھنا پڑے گا کہ تہذیب ہو یا تاریخ شاعری اور زندگی تفصیل میں نہیں ڈھلتی اجمال میں ڈھلتی ہے ۔ " دو چار بڑے سخت مقام " میں ایک مقام یہ بھی ہے !

فراق بڑے شاعر اور بڑی شاعری دونوں کی پہچان رکھتے ہیں ۔ اور اچھے اچھوں سے زیادہ پہچان رکھتے ہیں ۔ البتہ یہ نہیں معلوم کہ وہ اس رمز سے بھی آشنا ہیں یا نہیں کہ بڑے کو جاننا اور چھوٹے پر اکتفا کرلینا گناہ ہے !

اقبال کی ابتدائی غزلیں زیادہ قابل اعتنا نہیں ہیں ۔ یہ وہ زمانہ تھا جب داغ کی زبان اور داغ کے کلام کی بڑی دھوم تھی ۔ یہ دونوں باتیں اقبال کے لئے بڑی کشش رکھتی تھیں ۔ اس لئے نہیں کہ اقبال آیندہ چل کر بڑے شاعر بننے والے تھے بلکہ اقبال نوجوان تھے ، طبعیت شاعرانہ پائی تھی اور ان کا دیار اردو کی سحرکاریوں کی

گرفت میں آچکا تھا ۔ لیکن اقبال کسی طرح داغ کی منزل پر دیر تک نہیں ٹھہر سکتے تھے وہ بہت جلد آگے بڑھ گئے اور اس تیزی سے آگے بڑھے کہ پھر انھوں نے تمام عمر داغ کی طرف مڑ کر نہیں دیکھا ۔ داغ کی منزل پر ٹھہر جانا کسی شاعر کے لئے کوئی بڑا کارنامہ نہیں ۔

اقبال نے دراصل داغ سے زبان نہیں سیکھی بلکہ شاعری میں زبان کی اہمیت پہچانی ۔ شاعری کے لئے اردو زبان اب اتنی پختہ اور "آزمودہ" ہوچکی ہے کہ کسی شاعر کا چاہیے وہ کتنا ہی ہونہار کیوں نہ ہو زبان سے بے تکلفی برتنا یا اس کے تقاضوں کو خاطر میں نہ لانا خود شاعر کے حق میں مفید نہ ہوگا ۔ اقبال کی غزل کی زبان اردو کے دوسرے غزل گویوں کی زبان سے مختلف بھی ہے اور مشکل بھی ۔ اقبال کو غزل کے لئے نئے انداز کی زبان وضع کرنی پڑی ۔ ایسی زبان اور ایسا لہجہ جس سے غزل نا آشنا تھی ۔ اس زبان کو غزل سے منوالینا بہت بڑا کارنامہ ہے ۔ گو یہاں اس امر کا بھی اعتراف کرنا پڑے گا کہ غالب کے ہمراہ اس راستے کے بہت سے کانٹے نکل چکے تھے ۔

اب ہمارے عام غزل گو شعراء خواہ وہ کسی ملک یا مرتبہ کے ہوں کچھ اور نہیں تو وہ ایک آدھ شعر

اقبال کے رنگ میں کچھ دینا ضروری سمجھنے لگے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ جب تک کوئی بات اقبال کے رنگ میں پیش نہ کی جائے گی ان کا کلام یا وہ خود قبول عام کی سند نہ پاسکیں گے۔ غزل میں اقبال کا رنگ نباہنا اقبال کے علاوہ کسی اور کے بس کی بات نہیں!

اقبال نے اپنی غزلوں میں ہم کو یہ محسوس کرایا کہ عشق و محبت دل ہی کا ماجرا نہیں بلکہ ذہن کا بھی ہے۔ نئی غزل گوئی کا یہی سنگ بنیاد ہے۔ غالب کے ہاں بھی دل و ذہن کا یہ ماجرا ملتا ہے۔ لیکن غالب کو یہ سہولت حاصل تھی کہ انھوں نے اپنے آپ کو کسی مخصوص مقصد یا نقطۂ نظر کا پابند نہیں رکھا تھا۔ وہ جو چاہتے تھے کہہ سکتے تھے۔ اقبال اپنے سامنے ایک مقدر رکھتے تھے جس سے وہ ہم کو آشنا کرانا چاہتے تھے یہ مقدر تھا اسلامی عقائد کی برتری اور اسلامی اعمال کی برگزیدگی کا۔ اپنی شاعری میں اقبال نے انھیں دو پرسب سے زیادہ زور دیا ہے۔

اقبال کی غزلوں میں ان تمام شکوک کی توجیہ مل جاتی ہے جو ان کے نظریوں کا نتیجہ بتائے جاتے ہیں۔ اقبال کے ہاں کوئی چیز مجرد نہیں ہے۔ حسن ہو، عقل

ہو ، عشق ہو ، مذہب ہو ، زندگی ہو ، فن ہو ، ادب ہو ،
وہ سب کو باہم دگرمربوط و مستحکم دیکھتے ہیں جزو
میں یہ علیحٰدہ علیحٰدہ رکھے جاسکتے ہیں ۔ لیکن کل میں
یہ سب ایک دوسرے کے حلیف ہیں حریف نہیں ۔

بڑی شاعری میں منجملہ اور باتوں کے دو نہایت
ضروری ہیں ۔ ایک تو اس کا رشتہ کسی اعلیٰ اور عظیم
حقیقت سے دوسرے اس کا ربط کسی اعلیٰ اور عظیم شخص
اور شخصیت سے ۔ علم تلاش حقیقت ہے ۔ شاعری جستجوئے
انسانیت ۔ بڑی سے بڑی کوئی ایسی حقیقت نہیں ہے جو
انسان کے لئے نہ ہو ۔ اقبال خدا کو سب سے بڑی حقیقت
تصور کرتے ہیں اور رسالت مآب کو سب سے بڑا شخص
اور شخصیت ۔ ذاتی طور پر میرا کچھ ایسا خیال ہے کہ
شاعری میں بڑے انسان کا ہونا لازمی ہے اور بڑا انسان
سب سے بڑے انسان کی نشان دہی کرتا ہے ۔

اقبال کے فلسفہ کی بنیاد اسی مقدر پر ہے جس کا
ذکر اوپر آیا ہے ۔ انھوں نے اپنے عقیدے کی بنیاد فلسفہ
پر نہیں رکھی ہے بلکہ اپنے عقیدے کو فلسفہ کا جامہ
پہنایا ہے ۔ اگر یہ جامہ عقیدہ کے جسم پر جہاں تہاں
چست نظر نہیں آتا تو اس سے اقبال کے عقیدے پر حرف

نہیں آتا ۔ عقیدہ یوں بھی فلسفہ کا دست نگر نہیں ہوتا ۔ عقیدہ یقین ہے فلسفہ نہیں ۔ یقین شخصی فلسفہ ہے ! اقبال عظمت آدم اور عظمت فرد دونوں کے داعی ہیں ۔ ان کے عقیدے کے مطابق ہر شخص (فرد) بے پایاں ترقی سے ہمکنار ہوسکتا ہے ۔ اسلامی عقیدہ اور عمل کا محور "کلمۂ گیتی نورد" ہے اس لئے اسلام کا تصور قومی وہ نہیں ہے جو آج کل سمجھا جاتا ہے ۔

مختلف ٹولیوں میں رہنے بسنے کی انسانوں میں جو خواہش ہے وہ دراصل سلامتی جان و مال کی بنا پر ہے ۔ تمدن کے ابتدائی دور میں یہ خواہش مفید تھی لیکن ترقی یافتہ زمانے میں اس کے خطرات مسلم ہیں جس کے نتائج ہر طرف ظاہر ہو رہے ہیں ۔

اقبال کو کمیونلسٹ (فرقہ پرست) بتایا جاتا ہے ۔ جس دیار میں فرقہ پرستی کی وبا پھیلی ہو وہاں بڑی شاعری اور بڑے شاعر کا تصور ذہنوں میں نہیں آسکتا ۔ اقبال پر ایک سرسری تنقید یہ کی جاتی ہے کہ وہ پہلے "سارے جہاں سے اچھا ہندوستان ہمارا" کے مبلغ تھے بعد میں "مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا" کے داعی بن گئے اس طرح پہلے وہ قوم پرست تھے بعد میں فرقہ پرست

ہو گئے لیکن تنقید نگار یہ نہیں دیکھتے کہ اقبال کی منزل مقصود کیا تھی اور اس منزل کے طے کرنے میں وہ کہاں سے کہاں تک پہنچے ہیں ۔ یہ اشعار ملاحظہ ہوں ۔

کریں گے اہل نظر تازہ بستیاں آباد
مری نگاہ نہیں سوئے کوفہ و بغداد

درویش خدا مست نہ شرقی ہے نہ غربی
گھر میرا نہ دلی نہ صفاہاں نہ سمرقند

تو ابھی رہگذر میں ہے قید مقام سے گزر
مصر و حجاز سے گزر پارس و شام سے گزر

نہ چینی وعربی اور نہ رومی و شامی
سما سکا نہ دو عالم میں مرد آفاق

فارغ تو نہ بیٹھے گا محشر میں جنوں میرا
یا اپنا گریباں چاک یا دامن یزداں چاک

کہیں اس عالم بے رنگ وبو میں بھی طلب میری
وہی افسانۂ و بنالۂ محمل نہ بن جائے

اقبال پر کمیونلزم کا اتہام رکھنے والوں سے درخواست کروں گا کہ وہ اشعار میں اقبال کی فکر و نظر کا مطالعہ کریں۔ اقبال بڑے شاعر تھے اور بڑا شاعر کمیونلسٹ نہیں ہوسکتا۔ ہمارے نقاد اس نکتہ سے یقیناً باخبر ہوں گے کہ بڑی شاعری کی سرحدیں کمیونلزم سے نہیں انسانیت سے ملی ہوتی ہیں!

مذہب کا حقیقی تصورحیات و کائنات کا بڑا تصور ہے اور ہر بڑی شاعری کا سوتا کسی نہ کسی عظیم تصورحیات و کائنات سے پھوٹتا ہے۔ یہ عظیم تصورحیات و کائنات اسلامی بھی ہوسکتا ہے عیسوی بھی اور ہندو بھی۔ ان معنوں میں میں اسلامی ادب، ہندو ادب اور عیسائی ادب سب کا قائل ہوں۔ بڑی شاعری کا ماخذ بیشتر مذہبی یا ماورائی رہا ہے!

کسی شاعر یا شاعری میں منطق، فلسفہ، ریاضی اور سائنس کا ربط ڈھونڈھنا اور نہ پانا تعجب کی بات نہیں ہے۔ شاعری علم نہیں ہے بلکہ شاعر کے فکر، تخیل تاثر یا تجربہ کا انفرادی جمالیاتی اظہار ہے جو مختلف حالات میں مختلف ہوسکتا ہے۔ ان میں منطقی ربط نہ ہونا عیب نہیں ہے۔ قرین فطرت ہے۔ شاعر انسان زیادہ رہتا ہے منطقی کم! اقبال کے مرد مومن کا مولانہ ہونا اور

مولاصفت پننا اقبال کے نظریۂ خودی کے عین مطابق ہے !

اقبال کو سمجھنے کے لئے یہ بات ذہن میں رکھنی پڑے گی کہ انھوں نے زمانہ ایسا پایا تھا جب سائنس، ادب، فلسفہ، مذہب، قومیت، تجارت، سیاست، سرمایہ داری سب کی سب زندگی کی نئی تقدیر سے دست و گریباں تھیں اور کتنے سفینے اور ساحل اس کی زد میں آکر پاش پاش ہو رہے تھے - اقبال نے جو کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا ان سے پہلے کے شعرا نے خواب میں بھی نہ دیکھا تھا پھر اقبال صرف شاعر نہ تھے مفکر بھی تھے، مسلمان بھی، مجاہد بھی اور معلم بھی - ان کی شاعری میں ان کی یہ حیثیتیں نمایاں ہیں -

ظاہر بین نظروں کو اقبال کے یہاں تضاد ملتا ہے لیکن اقبال مسائل حیات کا حل خانوں میں نہیں تلاش کرتے تھے، ایک عالمگیر عقیدۂ رحمت و منزلت میں سوچتے تھے -

اقبال سے پہلے کوئی ایسا شاعر نہیں گزرا تھا جس نے قوموں کی تقدیر اور انسانیت کے تقاضوں کا اتنا گہرا مطالعہ کیا ہو جتنا کہ اقبال نے، وہ ہمارے تمام شعراء سے زیادہ لکھے پڑھے شاعر تھے ان کا مطالعہ بڑا وسیع تھا علوم و فنون ہی کا نہیں، یزداں، انسان اور شیطان سبھی

کا ، ان کی نظر میں وہ تمام تہلکے اور تحریکیں تھیں جن سے زندگی دو چار تھی اور انسانیت معرض خطر میں ! ایسے وقت میں یا تو پیغمبر پیدا ہوتے ہیں یا شاعر - ہندوستان میں دونوں پیدا ہوئے مہاتما گاندھی اور اقبال !

اقبال کی شاعری اور ان کے افکار کے سمت و رفتار کے مطالعہ سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اقبال نے فن کے رموز ، زبان کی اہمیت ، اور شاعری میں فکر ، جذبہ اور تخیل کے مقامات پہچاننے میں کتنا ریاض کیا - ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے شاعری نے اقبال کو اقبال بنانے میں اپنی ساری آزمائشیں ختم کر دی ہوں اور اس کے بعد ان پر اپنی ساری نعمتیں بھی تمام کر دی ہوں جیسے اردو شاعری کا دین اقبال پر مکمل ہوگیا ہو !

اقبال کی نظموں میں غزل کی اور غزلوں میں نظم کی خوبی اور خوشنمائی ملتی ہے - نظم کا زور اور غزل کی زیبائی - اقبال نے بڑی محنت ، تلاش ، تجربہ اور تراش خراش کے بعد اپنی غزلوں کے لئے ساز اور سانچے بنائے - یہ ساز اور یہ سانچے کسی دوسرے غزل گو کے بس کے نہیں - غالب کے بعد اقبال نے اردو شاعری کو فارسی سے ایک نئی محکمی بخشی اور فارسی کی فتوحات میں ایک

قابل قدر اضافہ کیا ۔

اقبال کی غزلوں میں وہ باتیں نہیں ملتیں جو اُردو غزل میں بہت مقبول تھیں مثلاً رشک و رقابت فراق و وصال جسم و جمال کا ذکر ، صنائع بدائع اور زبان و بیان کی نمائش جن کے بغیر غزل ، غزل نہیں سمجھی جاتی تھی اور جن کو ہمارے بیشتر شعراء اپنا اور اپنے کلام کا بڑا امتیاز سمجھتے تھے ۔ اقبال نے اپنی غزلوں میں عام غزل گو شعراء کی طرح نہ زبان رکھی نہ موضوع ، نہ لہجہ ، بلکہ ایسی زبان ، موضوع اور لہجہ اختیار کیا جن کا غزل سے ایسا کوئی رشتہ نہ تھا ۔ اس کے باوجود ان کی غزلوں میں تنوع و تاثیر ، شیرینی و شائستگی ، نزاکت و نغمگی کے علاوہ جو اچھی غزل کے لوازم ہیں وہ فرو فرزانگی اور قاہری اور دلبری ملتی ہے جو بعض مناظر فطرت اور صحف سماوی میں ملتی ہیں ! اقبال کی غزلوں کے سامنے ہم بے ادب یا بے تکلف ہونے کی جراٗت نہیں کرسکتے ۔

اقبال نے غزل کی بزمیہ کو رزمیہ کے درجے پر پہنچا دیا ۔ انھوں نے غزل کو محفل سماع اور بزم ماتم سے نکال کر مجاہدوں کی صف اور دانشوروں کے حلقے میں پہنچا دیا ۔

اقبال کی نظموں کا شباب اقبال کی غزلوں کی شراب میں ڈوبا ہوا ہے - عشق نے جامی سے جب تک " ترک نسب ،، نہیں کرالیا اپنی حریم میں داخل نہیں ہونے دیا - یہی حال غزل کا ہے - جب تک اس نے اقبال سے ترک نسب نہیں کرالیا اپنی بارگاہ میں آنے کی اجازت نہیں دی - غزل صرف اپنے نسب کا احترام کرتی ہے - کافر آفاق میں گم ہوتا ہے مومن میں آفاق گم ہوتا ہے - اقبال کو غزل میں گم ہونا پڑا -

مجھے اکثر یہ محسوس ہوا ہے کہ بیسویں صدی میں شاعری نے مشرق کی پیغمبری اقبال اور ٹیگور کو تفویض کی اور مشرق کا شاید ہی کوئی ایسا شاعر ہو جس نے اس کا حق اس خوبی، خلوص اور خوبصورتی سے ادا کیا ہو جتنا کہ ان دونوں نے ! میرا خیال ہے کہ جہاں تک آردو شاعری کا تعلق ہے کم سے کم اس صدی کے بقیہ نصف میں شاید اقبال سے بڑا شاعر نہ پیدا ہوگا - البتہ اقبال کے تصرف سے ایک سے ایک اچھے شاعر پیدا ہوتے رہیں گے- - بڑی شاعری اور بڑے شاعر کی یہ کھلی ہوئی نشانی ہے !

اقبال کے بعد غزل کی زبان آہنگ اور موضوع میں مزید توسیع اور تبدیلی ہوئی جس میں اشترا کی تصورات کا

بھی دخل ہے - ان تصورات نے ارضیت ، وطن دوستی اور
مادی خوش حالی کے جذبات کو ابھارا ساتھ ہی ساتھ سیاسی
اور وقتی حالات و حوادث بھی آئے جن کو شاعری کے
نقطۂ نظر سے میں زیادہ قابل توجہ نہیں سمجھتا - ان
موضوعات نے کوئی بڑا شاعر یا غزل گو نہیں پیدا کیا -
ممکن ہے اس کا ایک سبب یہ بھی ہو کہ ہندوستان کی
نئی تہذیب کا نقشہ ابھی واضح نہیں ہے - پھر ہمارے
ترقی پسند شعراء جنتا کے ہیں ، جنتا سے نہیں ہیں - اس سے
بھی فرق پڑ گیا ہے - گو ذاتی طور پر میں یہ سمجھتا ہوں
کہ جنتا کا اچھا اور بڑا شاعر ہونے کے لئے خود شاعر کا
جنتا سے ہونا ضروری نہیں ہے -

سوسائٹی کی موجودہ طبقاتی تقسیم کے بارے میں
چاہے جو کچھ کہا جائے لیکن یہ بات اپنی جگہ پر ضرور
وقعت رکھتی ہے کہ شاعری ہو یا دوسرے فنون لطیفہ یا
کوئی اور بڑا ذہنی کارنامہ یہ سب سوسائٹی کے منفرد
اشخاص کے سہارے نشو و نما پاتے ہیں اور آگے بڑھتے
ہیں - خواہ یہ منفرد اشخاص اونچے طبقے میں پیدا ہوئے
ہوں خواہ نچلے طبقے میں - میں اسے بھی مانتا ہوں کہ
اونچے طبقے میں منتخب افراد کے پیدا ہونے کا امکان زیادہ
رہتا ہے - اقدار اور روایات زندگی میں اس طور پر پیدا یا

نمودار نہیں ہوتیں جس طرح فطرت میں حیوانات اور نباتات پیدا ہوتے اور پروان چڑھتے ہیں۔ اقدار اور روایات سوسائٹی کے بہترین افراد کے فکر و عمل کے کسر و انکسار کا نتیجہ ہوتے ہیں۔

سوسائٹی کے بارے میں میرا کچھ ایسا خیال ہے کہ وہ بجائے خود ایک لایعقل لیکن سودمند ادارہ ہے اور صلح پسند اور سادہ مزاج لوگوں کی جائے پناہ۔ سوسائٹی منتخب افراد کو جنم دے کر بانجھ ہو جاتی ہے۔ اور اس کا کوئی مصرف باقی نہیں رہ جاتا ۔ یہ منتخب افراد نئی سوسائٹی کو جنم دیتے ہیں۔ اس سوسائٹی کو بھی بالآخر وہی دن دیکھنے پڑتے ہیں جو پہلی کو دیکھنے پڑے تھے۔ ایک ہی سوسائٹی دوبارہ منتخب افراد کو جنم نہیں دے سکتی۔

غزل کی زبان میں جو توسیع ہوئی ہے وہ پرانے الفاظ کے مفہوم کی توسیع اور نئی تشبیہات استعارات کی آمد ہے۔ فراق کے زیر اثر ہندی عناصر کی آمیزش بھی نمایاں ہونے لگی ہے۔ لسانی نقطۂ نظر سے غزل گو کے لئے یہ بحرانی دور ہے۔ زبان کے سانچے زد میں ہیں اور کہیں کہیں سے شکست کی آواز بھی آنے لگی ہے۔ لیکن اردو غزل جس عمل وردِ عمل سے گذر رہی ہے وہ اتنا اہم نہیں ہے جتنا وہ

بحران جس سے فراق دو چار ہیں ۔ فراق کی شاعری میں ہندی عناصر کرم کے جس چکر میں ہیں دیکھنا یہ ہے کہ وہ نروان کے قریب آرہے ہیں یا دور جارہے ہیں !

ترقی پسند شاعری اور ادب کی ابتدا اصلاحی یا ادبی نہ تھی سیاسی اور اشترا کی تھی ۔ اس کی عمر بیس پچیس سال سے زیادہ نہیں ہے ۔ سیاسی اور اشترا کی اعتبار سے اسے چاہے جتنی ترقی ہوئی ہو اصلاحی اور ادبی اعتبار سے اس کو کامیابی نہیں ہوئی ۔ اس کا ایک سبب یہ ہوسکتا ہے کہ آزادی ، بیداری اور عام انسانی ہمدردی کا تصور اردو میں نیا نہ تھا ۔ حالی اور اقبال نے بڑے خلوص اور خوبصورتی کے ساتھ ان باتوں کو ہمارے دلوں میں اتار دیا تھا اور اردو شاعری اس رنگ و آہنگ سے پورے طور پر آراستہ و استوار ہوچکی تھی ۔ اقبال نے جس روح کو بیدار کر دیا تھا اس کے مقابلے میں اس طرح کے انقلاب کے لئے زیادہ گنجائش نہیں رہ گئی تھی جس کی بشارت ترقی پسند دے رہے تھے ۔ جس شعر و ادب میں غالب ، حالی ، اکبر اور اقبال کی ”جنیسیس Geniuses“ کارفرما رہی ہوں وہاں اس قسم کی شاعری کے پنپنے کا امکان کم ہے جس کا نمونہ ترقی پسند شعرا پیش کر رہے تھے ۔ اردو شاعری کی مروجہ و مقبول ہیئت کو بھی ترقی پسند شاعری متاثر نہ کرسکی ۔

ترقی پسند تحریک نے افسانوی ادب میں اضافہ ضرور کیا لیکن اس کے لیے پریم چند راستہ صاف کرچکے تھے - وہ ترقی پسندوں سے بہت پہلے عوام تک پہنچ کر ان کے دلوں میں گھر کرچکے تھے - اس طور پر یہ کہنا بے محل نہ ہوگا کہ ترقی پسند ناولوں اور افسانوں کے لئے پریم چند نے دروازے کھول دئے تھے دوسری طرف ترقی پسند شاعری کے لئے اقبال نے دروازے بالکل بند نہیں کر دئے تھے تو ان کو کچھ زیادہ کھلا بھی نہیں رہنے دیا تھا !

ترقی پسند شعر و ادب اور پرانے شعر و ادب کے علمبرداروں میں جو تلخ و تند آویزش رہی وہ اب بہت کچھ ماند پڑگئی ہے - ماند ہی نہیں معطل سی ہوگئی ہے - اس کا سبب میرے نزدیک یہ ہے کہ اول الذکر کا سابقہ ایسے شعر و ادب سے ہوا جو کافی جاندار اور ترقی یافتہ تھا اور اس کی عام سطح اس سطح سے بلند تھی جس پر ترقی پسند خود تھے یا جس پر لانے کی وہ دعوت یا دھمکی دے رہے تھے - یہ برتری زبان ، لہجہ ، فن ، ہیئت موضوع ہر اعتبار سے مسلم تھی !

دوسرے یہ کہ ترقی پسندوں نے جن کمزوریوں اور کوتاہیوں پر زور دیا وہ زیادہ تر غلامی اور محکومی کے

نتائج میں سے تھیں ۔ ہندوستان کو آزادی مل گئی تو ان کمزوریوں کے دیر یا سویر دور ہونے کا امکان خود بخود پیدا ہوگیا معاشی بدحالی ، سیاسی استیلا اور اخلاقی بداطواریوں کو اچھالنے کی گنجائش باقی نہ رہی ! پھر یہ کہ آزادی حاصل کی گئی تھی کسی جور ظلم یا فریب و فساد سے نہیں بلکہ اعلیٰ اخلاقی سطح سے اور یہ ایک ایسے شخص کی ذاتی فتح تھی جو اعلیٰ ترین اخلاق و اصول کا داعی تھا ۔ ظاہر ہے اس کا اثر ہندوستان کی زندگی ، ذہن اور روح پر کیا پڑا ہوگا !

مہاتما گاندھی کی اس فتح نے اعلیٰ شعر و ادب کا فروغ ہندستان ہی میں نہیں سارے جہاں میں مسلم کر دیا ۔ اور جس طرح کا شعر و ادب جس طریقے سے اردو میں پیش کیا جا رہا تھا وہ ہمیشہ کے لئے نہیں تو ایک طویل مدت تک کے لئے سرد پڑ گیا ۔

تیسری بات یہ ہے کہ اشترا کی عقیدہ یا ادب کی تبلیغ جن لوگوں نے کی ان میں سے بیشتر نہ ہندوستان کے کچھ ایسے شیدائی تھے نہ اردو شعر و ادب کے ، نہ ان دونوں کے اخلاقی اقدار اور تہذیبی روایات کے ! ایسا شخص شعر و ادب کا خیر اندیش اور خدمت گذار کیسے

ہوسکتا ہے جو فکر کی آزادی ، جذبے کی پاکیزگی ، خیال
کی بلندی اور انشاء کی موزونی کا قائل نہ ہو ۔ قوم ، ملک
آرٹ اور ادب کی تقدیر جاگتی جگمگاتی ہے بے پایاں
خلوص اور خدمت سے ۔ حکمبر داری ، آبرو ریزی ، اور فتنہ
سامانی سے نہیں !

شاعری کرنی ہے تو شاعری کے آداب ملحوظ رکھنے
پڑیں گے ۔ شاعری مقصد نہ سہی وسیلہ سہی ، لیکن یہ
ایسا وسیلہ نہیں ہے کہ آپ اسے جس طرح چاہیں برتیں ۔
اعلیٰ مقصد کے حصول کا وسیلہ بھی اعلیٰ ہونا چاہئے ۔
شاعری مقصد کی باندی نہیں بنائی جاسکتی چاہے وہ مقصد
کتنا ہی عظیم الشان کیوں نہ ہو ۔ میرے نزدیک کوئی
شاعر اس کا مجاز نہیں ہے کہ خدا کی تعریف بھی خراب
شاعری میں کرے ۔ شاعری میں عبادت نہیں کی جاتی
شاعری کا حق ادا کرنا پڑتا ہے !

میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ اشتراکی عقیدہ اور
اشتراکی شعر و ادب ہو یا کوئی اور عقیدہ اور شعر و ادب
ہندوستان میں اس کو اس وقت تک فروغ یا پائنداری نصیب
نہ ہوگی جب تک اس کو مہاتما گاندھی جیسی شخصیت
اور اقبال جیسا شاعر نہ ملے گا !

اشتراکیت تاریخ کا تقاضہ ہو یا بیالوجی کا اصول، اسلوب فکر ہو یا انداز حکومت یا نظام معیشت، اس عام زندگی سے ہم آہنگ نہیں ہے جس سے ہم اب دو چار ہیں۔ خواہ وہ زندگی سماجی ہو یا اقتصادی، فکری ہو یا اخلاقی۔ اب کا لفظ میں نے جان بوجھ کر کہا ہے۔ اس لئے کہ جس زمانے میں اشتراکیت وجود میں آئی اس وقت سے لے کر کچھ زمانے تک تو یہ بعض تقاضے پوری کرتی رہی۔ اس اعتبار سے اس کو کامیاب کہہ سکتے ہیں اس کی عمر دوسرے مسالک کی عمر سے کم ہے۔ بہت کم۔ لیکن اردو شعر و ادب میں اس کے جو طور طریقے اور نتائج دیکھنے میں آئے اس سے کچھ اس طرح کا احساس ہونے لگا ہے جیسے اس کی آمریت اور افادیت دونوں ختم ہونے پر آگئی ہوں! اس کے کہنے سے اشتراکیت کی توہین مقصود نہیں ہے۔ بلکہ یہ کہنا ہے کہ دوسری جنگ عظیم کے بعد سے انسان کی فکر اتنی آزاد ہو گئی ہے اور اس کو پھیلانے اور برسرکار لانے کے اسباب اور وسائل اتنے عام اور آسان ہوگئے ہیں کہ اب کوئی تحریک زیادہ دنوں تک زندگی کے نو بہ نو تقاضوں کا ساتھ نہیں دے سکتی۔ اس طور پر اشتراکی آمریت ہو یا امریکی آمریت انسان کے فکر اور عزائم کی آزادی کی تاب نہیں لا سکتی۔

اس دور ترقی میں انسان کی عمر طبعی بڑھنے لگی ہے لیکن اس سے کہیں تیز رفتاری کے ساتھ تحریکوں، تجربوں اور اداروں کی عمریں گھٹنے لگی ہیں۔ جو تحریک، تجربہ یا ادارہ پہلے کبھی صدیوں زندہ اور کارآمد رہتا تھا اب ایک آدھ نسل سے زائد موثر نہیں رہ پاتا۔ موجودہ زندگی وہ زندگی نہیں رہی جو آج سے پہلے تمدنی یا نیم تمدنی حلقوں میں بٹی چلی آ رہی تھی جس کے اپنے جانے پہچانے طور طریقے تھے۔ یہ طور طریقے چھوٹے بڑے حلقے کی ضروریات کے لئے کفایت کرتے تھے۔ ان میں انقلابات بھی آتے رہتے تھے لیکن ان انقلابات کی مثال ایسی ہے جیسے اس طرح کے حلقوں میں جہاں تہاں ٹائم بم رکھ دئے گئے ہوں جن کے پھٹنے پر تہلکہ مچتا ہو اور زندگی چھوٹے بڑے جھٹکے کھا کر ہموار ہوجاتی ہو اور تھوڑی بہت ٹوٹ پھوٹ کے بعد وہ حلقے پھر سے قائم ہوجاتے ہوں!

لیکن ایک صبح بنارس یا شام اودھ ایسا ہوا کہ ایٹم بم پھٹا اور پھر —! نہ کہیں کی صبح رہ گئی نہ کہیں کی شام! جتنے گھر گھروندے تھے سب مسمار ہوگئے خواہ وہ افکار کے رہے ہوں خواہ اعمال کے خواہ پرانے رہے ہوں خواہ نئے۔ یہی سبب ہے کہ ترقی پسند

ادب جو ادب کے تقاضوں سے زیادہ اشتراکی تصورات کے
تقاضوں پر زور دیتا تھا اپنی اہمیت زائل کرنے لگا ۔ یہ
حال ترقی پسندی ہی کا نہیں کم و بیش ہر تصور اور
تحریک کا ہوا ۔ چنانچہ ترقی پسند ادب کے مبصرین اب
کچھ اس طرح سوچنے لگے ہیں کہ عام زندگی کا رنگ
جو اب ہے وہ شاعری کے لئے سازگار نہیں ہے یا ادب پر
جمود طاری ہے یا شاعری کا مستقبل روشن نہیں ہے !

میرے نزدیک یہ خیال صحیح نہیں ہے کہ سائنس
کے انکشافات اور زندگی کی روزافزوں حشر سامانی شاعری
کے لیے سازگار نہیں ہے ۔ میں کچھ اس طرح سوچتا ہوں
کہ یہ دونوں شاعری کو پابجولاں نہیں بلکہ مہمیز کرتی
ہیں ۔ دونوں کا سرچشمہ انسان ہے ، سائنس ، شاعری ،
مذہب تینوں عظیم ذہنوں کا کارنامہ ہیں اور عظیم ذہن
جماعت یا اداروں کا نہیں ہوتا افراد کا ہوتا ہے ۔ عظیم
ذہنوں سے دنیا کبھی خالی نہ رہے گی خواہ افراد کے ذہنوں
پر کتنی ہی سخت پابندی کیوں نہ لگادی جائے ذہنوں
پر پابندی عائد کرنا عہد جہالت کی یادگار ہے ۔ خلاصہ
یہ کہ سائنس شاعری اور مذہب تینوں باہمدگر حلیف ہیں
تاوقتیکہ سوسائٹی میں کوئی بہت بڑا فتنہ راہ نہ پا گیا ہو ۔

شاعری قافیہ پیمائی نہیں ہے ۔ شاعری زندگی کو

آئینہ وغیرہ بھی نہیں دکھاتی ۔ اس طرح کی حرکتیں
دوسرے تیسرے درجہ کے شعرا اور ادیب کرتے ہوں گے ،
شاعری زندگی آزمائی ہے ۔ وہ زندگی جو انعام بھی ہے
آزمائش بھی ۔ شاعری زندگی سے کچھ کم بڑا مسئلہ نہیں
ہے زندگی کو آپ چاہیں تو امریکی یا روسی خانوں میں
بانٹ لیں شاعری خانوں میں نہیں بانٹی جا سکتی اس لئے
کہ شاعری دنیا کی مادری زبان ہے !

میرا کچھ ایسا خیال ہے کہ ترقی پسند شاعری
اور ادب کا اب وہ زور نہیں رہا جو کبھی پہلے تھا اور
یہ انجام ہے بعض دوسری باتوں کے علاوہ آن کڑی
پابندیوں کا جو اس نے اپنے شاعروں اور ادیبوں پر عائد
کر رکھی ہیں کہ ہر پھر کروہ اشتراکی عقائد اور تصورات
ہی کے دائرہ میں قدم رکھیں ۔ نتیجہ یہ ہوا کہ شاعر اور
ادیب بند گلیوں میں جا پڑے اور تازہ ہوا ، تازہ غذا اور
تازہ فضا سے محروم ہو کر ادبی انیمیا میں مبتلا ہو گئے ۔ ان
میں آپس میں بحث و تکرار بھی ہونے لگی ہے ۔ انیمیا میں
یہ بھی ہوتا ہے ۔ ترقی پسند اداروں کے علاوہ دوسرے
اجارہ داروں کو بھی سوچنا چاہیے کہ جس عہد میں سخت
سے سخت مادی اور ذہنی بندھن ٹوٹ رہے ہوں وہاں اس
طرح کی عائد کی ہوئی بندشیں کب تک ساتھ دیں گی !

ترقی پسند ادب کی موجودہ رفتار اور رنگ دیکھ کر بعض ائمہ فن نے اشتراکی اور غیر اشتراکی تصورات شعر و ادب میں بیچ بچاؤ کرانے کی غرض سے ایک طرح کے 'علم کلام' کی داغ بیل ڈالنی شروع کردی ہے اور ظاہر ہے مذہب پر جب کبھی سخت وقت آیا ہے علم کلام کا سہارا تلاش کیا گیا ہے۔

ترقی پسند شاعری کے ذکر سے اکثر نظیراکبرآبادی کے عہد اور شاعری کی طرف ذہن منتقل ہوتا ہے ۔ بتایا یہ جاتا ہے کہ ترقی پسند شاعری کا نقش اول نظیر اکبرآبادی کے ہاں ملتا ہے اور نظیر آردو کے پہلے عوامی شاعر ہیں ۔ شیفتہ نے نظیر کی شاعری کے بارے میں جو حکم لگایا تھا وہ سب کو معلوم ہے ۔ مدت بعد شیفتہ کے اس ریمارک سے بیزاری کا اظہار کیا گیا ۔ نظیر کے کلام کو سراہا گیا اور طرح طرح سے عقیدت کے نذرانے پیش کیے گئے۔

نظیر کی شاعری کا بعد کی شاعری پر کیا اثر پڑا اس پر بحث کا یہ موقع نہیں ہے ۔ بذات خود میرا خیال ہے کہ کوئی قابل لحاظ اثر نہیں پڑا ۔ آردو شاعری میں خارجی موضوعات کو منظم طریقے سے مقبول عام بنانے کا سہرا حالی ، آزاد ، اسمعیل ، شبلی ، اکبر ، چکبست ،

اقبال وغیرہ کے سر ہے - میرا یہ بھی خیال ہے کہ ان میں سے کسی کے پیش نظر نظیر کی شاعری نہ تھی - نظیر اپنی شاعری کے موجد یا محرک خود تھے - نہ وہ کسی جماعت یا ادارہ کے مصالح اور مقاصد کو سامنے رکھ کر شاعری کرتے تھے نہ کسی نے ان کی شاعری کو اپنے لئے نمونہ بنایا -

شیفتہ شاعری کے معیار پر زیادہ زور دیتے تھے ، شاعری کے موضوعات کو اہمیت نہیں دیتے تھے - موضوعات بے شمار ہیں یہ گھٹتے بڑھتے بدلتے رہتے ہیں - موضوعات کا نفس شاعری سے بجائے خود کوئی ایسا بڑا تعلق بھی نہیں - ہر موضوع شاعری کا موضوع ہوسکتا ہے - حالی سے حال تک موضوعات میں بڑی وسعت ہوئی ہے لیکن معیار میں کہیں فرق نہیں آنے دیا گیا - شیفتہ نے نظیر کی شاعری کے بارہ میں جو کچھ کہا اسی طرح کی باتیں ترقی پسند شاعری اور ادب کے بارہ میں کہی گئی ہیں - اور موضوع کو معیار پر مقدم رکھنے کی کبھی تائید نہیں کی گئی - اردو شاعری کا یہ نکتہ بڑا اہم ہے کہ وہ موضوع مواد ، ہیئت ، سب کو انگیز کر لیتی ہے اور سب کا خیر مقدم کرتی ہے - صرف معیار کے معاملہ میں مفاہمت کرنے پر تیار نہیں ہوتی -

اکثر ترقی پسند شاعر غزل گو ہیں لیکن جس کو ترقی پسند غزل گوئی کہہ سکیں وہ مجھے نظر نہیں آتی ۔ سوا فراق اور فیض کی غزلوں کے جس میں نئے رجحانات کے بعض جمیل و جامع نمونے ملتے ہیں ۔ ترقی پسندی اب تک غزل گوئی کو اپنی کوئی واضح چھاپ نہیں دے سکی ہے ۔ باوجود اس کے کہ نئی مصطلحات اور موضوعات کا غزل میں بڑی آزادی سے اضافہ کیا گیا ترقی پسندوں کی غزل گوئی سے غزل "ترقی پسند" نہ ہوئی ۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ اشتراکیت یا ترقی پسندی کا جتنا واضح آب و رنگ افسانوں ، ڈراموں ، نظموں اور تنقید میں ملتا ہے غزل میں نہیں ملتا ۔ غزل میں اس کو میں ترقی پسندی نہ کہوں گا کہ غزل کہنے کے دوران میں عمداً یا سہواً جہاں تہاں اشتراکیت کی اصطلاحات ، نشانات ، یا علامات ڈالتے گئے مثلاً آگ ، خون ، انقلاب ، بھوک ، سرمایہ ، جاگیر جنس ، مذہب وغیرہ اور اپنی غزل کے ترقی پسند ہونے کا یقین کچھ اس طور پر کر لیا ، مثلاً ۔

آتش لکھی یہ تونے غزل عاشقانہ کیا !

ترقی پسند تحریک یا ترقی پسند شعرا نے اردو افسانہ ، ناول یا تنقید کو چاہیے جو کچھ دیا ہو اس سے یہاں بحث نہیں ، اردو غزل کو اس نے کچھ نہیں دیا ۔

یا کچھ دیا تو اس کی کوئی ایسی حیثیت و اہمیت نہیں!
موجودہ غزل میں ان دنوں جو بیزاری، بے اطمینانی، تلخی
تکان یا طنز ملتی ہے یا اس انداز کی کچھ اور باتیں نظر آتی
ہیں وہ اتنی ترقی پسندی کی دی ہوئی نہیں جتنی تقسیم
ملک کی لائی ہوئی قیامتوں کا نتیجہ ہیں۔ ان کا براہ راست
کوئی تعلق ترقی پسندی سے نہیں ہے۔ یہ مسئلہ بھی
دلچسپی سے خالی نہیں ہے کہ ترقی پسندی نے دوسرے
اصناف شعر و ادب کو متاثر کیا ہو یا نہیں غزل کو بالکل
نہ کرسکی۔ یہی نہیں بلکہ غزل کو رسوا کرنے میں وہ
خود رسوا ہوگئی۔ مجھے تو کبھی کبھی یہ خیال آتا ہے
کہ ترقی پسندی نے آنکھ بند کرکے غزل پر حملہ نہ بول
دیا ہوتا تو وہ اتنا جلد اپنا اعتبار نہ کھو بیٹھتی۔

ترقی پسند غزل گویوں کے نام گنانے سے کچھ
حاصل نہیں، جیسا کہ میں اپنا خیال ظاہر کرچکا ہوں،
ترقی پسند غزل گو دوسرے غزل گویوں سے کچھ علیحدہ
نہیں ہیں۔ ان میں غزل گو ہیں اور بڑے اچھے غزل گو
تاوقتیکہ کسی نہ کسی مصلحت کی بنا پر وہ ترقی پسند ہونے
کا اعلان کرنا نہ شروع کر دیں اس وقت وہ ترقی پسند ہو
جاتے ہیں اور اتنے شدید ترقی پسند کہ غزل اور غزل گوئی
سب کو بہت پیچھے چھوڑ جاتے ہیں۔

میرے نزدیک ترقی پسند غزل گویوں میں صرف فراق اور فیض ایسے ہیں جنھوں نے غزل کو ایک نیا مزاج اور زاویہ دے کر اس کی خوبی و خصوصیت میں اضافہ کیا ہے - گو میں کچھ اس طرح بھی محسوس کرتا ہوں کہ یہ اضافہ اتنا ترقی پسندانہ نہیں جتنا شاعرانہ ، عارفانہ ، یا عارفانہ شاعرانہ ہے - فیض نے غزلیں نسبتاً بہت کم کہی ہیں - فیض کی بعض نظمیں ایسی ہیں جو اردو کی بہترین نظموں کے ہم پہلو رکھی جاسکتی ہیں - یہی سبب ہے کہ جب وہ غزل کی طرف مائل ہوتے ہیں تو ان کی نظم کی خوبیاں اور زیادہ نکھر اور سنور کر ان کی غزلوں میں ڈھل جاتی ہیں ! یہی بات میں نے اقبال کے بارے میں کہی تھی -

فیض جیسا کہ سب جانتے ہیں اول سے آخر تک اشتراکی ہیں لیکن غزل کا مزاج و مقام جیسا فیض نے پہچانا ہے ان کے دوسرے ساتھیوں نے نہیں پہچانا - فیض کی غزلوں کے مطالعہ سے اکثر یہ محسوس ہوا ہے جیسے شعر کہتے وقت وہ ترقی پسندی اور اشتراکیت کی "آرائش خم کاکل" میں اتنے منہمک نہ ہوں جتنے "اندیشہائے دور دراز" میں غالب اور اقبال کا احترام پیش نظر رکھتے ہوں -

غالب اور اقبال کا احترام پیش نظر رکھنے سے فیض کچھ کم اشتراکی یا ترقی پسند نہیں ہوگئے ہیں۔ کہنا یہ ہے کہ شاعری میں موضوع کو اسی طرح سمونا کہ شاعری موضوع شاعری معلوم ہونے لگے بڑے شاعر کی بڑی اچھی پہچان ہے۔ جب تک کوئی شاعر اپنا ہوتے ہوئے سب کا شاعر نہ ہوگا بڑا یا اچھا شاعر نہ کہلائے گا۔ ترقی پسند شاعروں میں یہ امتیاز فیض کے سوا شاید ہی کسی اور کو میسر ہو۔

فیض کو میں نے غالب اور اقبال کے قریب بتایا ہے لیکن ایک چیز مجھے کھٹکتی ہے وہ یہ کہ فیض کو زبان پر اتنی قدرت نہیں ہے جتنی اقبال اور غالب کو تھی۔ صحت زبان کو اردو شاعری میں جو اہمیت حاصل ہے فیض نے اس کی طرف اتنی توجہ نہیں کی جتنی ان کی شاعری کا تقاضا ہے۔

بحثیت مجموعی ہمارے غزل گویوں پر اقبال اور ترقی پسند شاعری کا تصرف نمایاں ہے۔ اقبال کا زیادہ ترقی پسندی کا کم!

جس طرح غزل گویوں کا پہلے عقیدہ تھا کہ جب تک زبان و محاورہ کی نمائش صنائع و بدائع کا اظہار کچھ عشق عاشقی کے پینترے نہ ہوں غزل گوئی کا حق نہیں

ادا ہوتا اسی طرح اب تھوڑی سی خودی بیخودی اور کچھ نہ کچھ افلاس و انقلاب کا ذکر بھی ضروری سمجھ لیا گیا ہے - ہمارے اردو شعرا چاہے جس انداز کی شاعری کرتے ہوں زمانہ اور زندگی کی طرف سے چوکنے ضرور ہو گئے ہیں - شاید زندگی اور زمانہ کی طرف سے اتنا نہیں جتنا اردو کے نقادوں کی طرف سے !

جب سے ترقی پسندی کا زور ہوا ، اردو میں تنقیدی سرگرمیاں بھی بڑھ گئیں - اچھے اچھے تنقید نگار پیدا ہوئے اور تنقیدی سرمایہ میں بڑا قیمتی اضافہ ہوا - ان تنقیدوں سے ہمارے سر برآوردہ غزل گو متاثر نہیں ہوئے - ان تنقیدوں کا رخ ان کی طرف اتنا تھا بھی نہیں - البتہ دوسرے خط محاذ یا مدافعت کے غزل گویوں پر ان تنقیدوں کا اثر ہوا - یعنی فیض ، جذبی ، مجاز ، مجروح ، ساحرلدھیانوی حفیظ ہوشیار پوری ، جگن ناتھ آزاد وغیرہ پر - تنقید کا غلبہ ہوتا ہے تو شاعری یا تخلیقی کارنامے کمزور پڑ جاتے ہیں یہ صحیح ہے لیکن جس زمانے میں ہمارے ہاں تنقید کا زور ہوا اردو شاعری میں نراج سا پھیلنے لگا تھا اور نئے پرانے کی آویزش تیز و تند ہو گئی تھی - اس زمانے میں تنقید نے شعر و ادب کو متوازن کرنے اور اس کو صحیح واستہ پر صالح قدروں کے ساتھ رہنموں کرنے میں بڑا قابل

قدر کام انجام دیا۔

نئی نسل میں چاہے بہت بڑے غزل گو یا شاعر موجود نہ ہوں اچھے نقاد کافی تعداد میں موجود ہیں۔ ایسے نقاد اس تعداد میں اور اس سوجھ بوجھ کے پہلے کبھی نہ تھے۔ اس سے امید بندھتی ہے کہ ہمارے اچھے لکھنے والے جلد بے راہ نہ ہو پائیں گے۔ شاعر اور ادیب پر نقاد کی بہت زیادہ گرفت نہ ہونی چاہیے ورنہ شعر و ادب سے تازگی طرفگی ، اور توانائی زائل ہونے لگتی ہے۔ لیکن اس وقت مجھے کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے ہمارے لکھنے والے اور ہمارے تنقید نگاروں میں کامل یگانگت ہے اور غزل اس پر آشوب دور سے نکل آئی ہے۔ جب اس کو رسوا کرنا بعض نقادوں کا بڑا سستا اور محبوب مشغلہ تھا۔ کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ خود غزل نے نقادوں کی چشم نمائی کی ہو۔

میں نے یہاں تک غزل کے اماموں کا تذکرہ کیا ہے غزل کے استادوں کا ذکر نہیں کیا۔ ان استادوں کے نام لینے کی جرأت نہیں کرسکتا۔ ان کے سامنے سرخم کرتا ہوں۔ انہوں نے غزل کی مشین کو ہمیشہ کیل کانٹے سے درست رکھا اور اپنے کام پر ایک لمحے کے لئے غافل نہیں پائے گئے۔ مشین کی کار کردگی اور اس کی فتوحات کا تمامتر مدار

اس پر رہا ہے کہ مشین پر کتنا ہی فشار کیوں نہ ہو اس کے دروبست اور کارکردگی میں فرق نہ آنے پائے۔

شاعروں کی نسل اکثر قطع ہوتی رہی اور نئی نسل وجود میں آتی رہی لیکن استادوں کی نسل کبھی نہ منقطع ہوئی۔ ازل سے اب تک جوں کی توں چلی آرہی ہے۔ اردو شاعری اس کی گواہی دے سکتی ہے۔ شاید کسی اور زبان کا شعر و ادب اس طرح کی گواہی دینے پر آمادہ نہ ہو۔ اردو شاعری کی تقدیر کا ان استادوں سے کیا رشتہ رہا اس کا اندازہ کیا جا سکتا ہے — ان کو

اللہ آبرو سے رکھے اور تندرست

[اب تک جو کچھ گفتگو ہو چکی ہے اس کے بعد یہ بتانے کی ضرورت باقی نہیں رہ جاتی کہ غزل کا مستقبل کیا ہوگا۔ میں تو سمجھتا ہوں اس کا مستقبل خطرہ میں نہیں ہے۔ البتہ یہاں یہ سوال اٹھایا جاسکتا ہے کہ آیندہ غزل کا رنگ و آہنگ کیا ہوگا۔ حسرت، اقبال، اصغر، فانی، جگر، فراق، فیض، وغیرہ کس کے بتائے، بنائے ہوئے راستے سے وہ آگے بڑھے گی۔ یہ سوال جتنا دلچسپ ہے اتنا ہی مشکل بھی ہے اور اس سے کچھ کم دلچسپ یا مشکل سوال یہ بھی نہیں ہے کہ آیندہ غزل کی قیادت ہندوستان

کے ہاتھ میں ہوگی یا پاکستان کے !

یہ سوالات ایسے نہیں ہیں جن کا جواب سرسری طور پر چند جملوں میں دیا جاسکے۔ اس کا انحصار اس پر ہے کہ اردو کی ہندوستان پاکستان کی اور سارے جہاں کی جس میں سبھی اسیر ہیں آیندہ کیا رفتار اور سمت ہوگی۔]

—*—

دیوانِ غالبؔ

مرزا اسد اللہ خاں غالبؔ

شاعروں کی اس رنگ برنگی محفل میں شمع کی جگہ خالی تھی، بڑے بڑے آئے مگر معیار پر کوئی بھی پورا نہ اُترا تو قُدرت نے مرزا اسد اللہ خاں غالبؔ کو برتری کا تاج پہنا کر شمعِ محفل بنا دیا، یہ شمع آج بھی جلوۂ ہائے رنگا رنگ دکھا رہی ہے۔ ایسی مثال پیدا ہوئی نہ ہونے کی توقع ہے۔

اُردو کے اس سب سے بڑے شاعر کا دیوان مستند نسخے "طاہر ایڈیشن" کے مطابق چھاپا گیا ہے۔

سائز $\frac{20 \times 30}{16}$ ۔ صفحات ۱۶۰ ۔ سفید کاغذ

اُردو اکیڈمی سندھ کراچی